Occasions of Revelation for *Sūrat Al-Tawbah* Verses regarding the Final Battle against People of the Book and Hypocrites

Muhammad Mushtaq Ahmed[۞]

ABSTRACT

The paper aims to ascertain the "occasion of revelation" for the verses of *Sūrat al-Tawbah* regarding the final battle against the People of the Book and the hypocrites during the era of the Prophet (peace be on him). It shows that verses 29 to 35, related to the war against the People of the Book, were revealed in the mid-7 AH and it were these verses which obliged Muslims to go on the Tabūk expedition against the Byzantines. Then, verses 38 to 42 were revealed when Muslims were preparing for the expedition. After this, verses 43 to 122 were revealed during and after the Tabūk expedition in four stages. Thus, verses 29 to 122 (with the exception of verses 36-37) of the *sūrah* have been placed in a chronological order. However, after this, the first part of the *sūrah* (verses 1-28 and 36-37) was revealed

۞ Director General (Shairah Academy)/ Associate Professor of Law, International Islamic University, Islamabad. (mushtaqahmad@iiu.edu.pk)

at the end of 9 AH in two stages: the first 12 verses were revealed before the *ḥajj* of 9 AH and verses 13 to 28 and 36-37 were revealed when the pagans tried to stage a counter-revolution against the Muslim rule. Then, the final part of the *sūrah* (verses 123 to 129) was revealed in two parts: first, verses 123-127 were revealed which made it obligatory for Muslims to continue fighting against the Byzantines and other non-Muslim powers in the vicinity of the Arabian Peninsula; second, the last two verses of the *sūrah* were revealed as the farewell message from the Prophet (peace be on him) to his community. Thus, the paper shows that the verses of the *sūrah* were revealed in a span of almost two years in ten pieces. It is hoped that this work on ascertaining the historical setting of the various groups of verses in the *sūrah* will help in gaining a better understanding of the message of the *sūrah*.

اہلِ کتاب اور منافقین کے خلاف حتمی جنگ کے متعلق سورۃ التوبۃ کی آیات کا زمانۂ نزول

محمد مشتاق احمد ۞

تمہید

سورۃ التوبۃ کے ابتدائی حصے (آیات ۱ تا ۲۸ اور آیات ۳۶-۳۷) کے زمانۂ نزول کی تحقیق پر اس سے پہلے دو مقالے **فکر و نظر** میں شائع ہو چکے ہیں۔[۱] ان مقالات میں پیش کی گئی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلی ۱۲/ آیات کا نزول غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد ۹ھ میں ہوا اور سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے حج کے موقع پر اعلانِ براءت کے لیے انھی آیات کی تلاوت فرمائی۔ اس اعلان کے بعد جب مشرکین کے سرداروں کی جانب سے فیصلہ کن جنگ کی دھمکی دی گئی تو اس کے بعد آیات ۱۳ تا ۲۸ اور ۳۶-۳۷، کا نزول ہوا جن میں مسلمانوں کو مشرکین کے ساتھ آخری جنگ کے لیے حتمی احکام دیے گئے اور ان کے ساتھ کسی قسم کی نرمی کی گنجایش نہیں چھوڑی گئی۔ اس بھرپور ردِ عمل نے مشرکین کو جنگ سے پہلے ہی پسپا کر دیا اور مہلت کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی ان کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا جب کہ بعض جزیرۂ عرب سے ہی نکل گئے۔ ان مقالات میں یہ بھی دکھایا گیا کہ فتح مکہ کے بعد مشرکینِ مکہ اور عام مشرکینِ عرب کو عارضی امان دی گئی جس کی رو سے ان کے لیے عارضی طور پر بیت اللہ الحرام میں آمد کا حق مان لیا گیا تھا، تاہم مشرکین کو معلوم تھا کہ حتمی فیصلے کا اعلان کسی بھی وقت ہو سکتا ہے، چناں چہ جب بالخصوص غزوۂ تبوک کے موقع پر مشرکین نے مسلمانوں اور اسلام کے خاتمے کے لیے منصوبے بنائے اور ان کی جانب سے عہد شکنی کا سلسلہ دراز ہوا تو اس عہدِ عام کے خاتمے کا اعلان کیا گیا، البتہ اعلانِ براءت کے باوجود ان کو فوری طور پر سزا دینے کے بجاے انھیں چار مہینے کی آخری مہلت دی گئی۔

۞ ڈائریکٹر جنرل (شریعہ اکیڈمی) / ایسوسی ایٹ پروفیسر لا، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔
(mushtaqahmad@iiu.edu.pk)

۱- دیکھیے: محمد مشتاق احمد "سورۃ التوبۃ کے ابتدائی حصے کا زمانۂ نزول اور تاریخی پس منظر: داخلی و خارجی شہادتوں کی روشنی میں تحقیقی جائزہ"، **فکر و نظر**، ۵۳: ۱ (۲۰۱۵ء)، ۹-۴۹؛ وہی مصنف "سورۃ التوبۃ کے ابتدائی حصے کا زمانۂ نزول اور تاریخی پس منظر: تحقیقِ مزید"، **فکر و نظر**، ۵۴: ۱-۲ (۲۰۱۶ء)، ۱۱-۴۰۔

اب اس تحقیق کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے زیرِ نظر مقالے میں پہلے ان آیات کا زمانۂ نزول متعین کرنے کی کوشش کی جائے گی جن میں اہلِ کتاب سے جنگ کا اعلان کیا گیا (آیات ۲۹ تا ۳۵) اور اس کے بعد سورت کی باقی آیات (۳۸ تا اختتامِ سورت) کے مختلف ٹکڑوں کے زمانۂ نزول کی تحقیق کی جائے گی جن میں منافقین کے مختلف گروہوں کے علاوہ مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا اعلان کیا گیا ہے۔ وباللہ التوفیق!

فصلِ اول

اہلِ کتاب کے خلاف اعلانِ جنگ کی آیات کا زمانۂ نزول

سورت کی آیات ۱ تا ۲۸ میں مشرکین سے کیے گئے معاہدات کے خاتمے میں اور پھر ان کے متعلق آخری فیصلے کا اعلان کیا گیا ہے۔ ان کے بعد آیات ۲۹ تا ۳۵ میں اہلِ کتاب سے جنگ کا اعلان کیا گیا ہے۔ پھر اگلی دو آیات (۳۶-۳۷) میں مشرکین ہی کے متعلق آخری فیصلے کی مزید ایک شق (رسمِ نسیء پاپابندی) کا ذکر ہے۔ شاید اسی وجہ سے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی (م ۱۹۷۹ء) نے یہ رائے قائم کی کہ ان آیات کا نزول بھی مشرکین سے اعلانِ براءت کی آیات کے ساتھ ذی القعدہ ۹ھ میں ہوا۔[۲] تاہم کئی وجوہ کی بنا پر یہ رائے صحیح معلوم نہیں ہوتی:

اولاً: پچھلے مقالات میں ہم تفصیل سے واضح کر چکے ہیں کہ مشرکین سے جنگ کی آیات کا نزول دو ٹکڑوں میں ہوا: پہلے آیات ۱ تا ۱۲ کا نزول شوال ۹ھ میں ہوا اور اس کے کچھ عرصے بعد آیات ۱۳ تا ۲۸ اور آیات ۳۶-۳۷ کا نزول ہوا۔ تاہم اگر درمیان کی آیات ۲۹ تا ۳۵ کا نزول ان سے قبل نہ ہوا ہوتا تو آیات ۳۶-۳۷ کو، جو مشرکین ہی سے متعلق ہیں، آیت ۲۸ کے بعد رکھا جاتا۔ نظمِ قرآن کے پہلو سے ان آیات کے درمیان آیات ۲۹ تا ۳۵ کا رکھا جانا، جن میں اہلِ کتاب سے جنگ کا حکم ہے، اس بات کی علامت ہے کہ آیات ۳۶-۳۷ کی حیثیت 'ضمیمے' کی ہے۔[۳]

ثانیاً: دوسری بات، جو زیادہ اہم ہے، یہ ہے کہ اہلِ کتاب میں یہود سے پہلے ہی چار بڑی جنگیں ہو چکی تھیں۔[۴]

۲- سید ابو الاعلیٰ مودودی، **تفہیم القرآن** (لاہور: ادارۂ ترجمان القرآن، ۱۹۷۴)، ۲: ۱۶۶۔

۳- مولانا اصلاحی کی یہی رائے ہے۔ دیکھیے: امین احسن اصلاحی، **تدبر قرآن** (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۲۰۰۱ء)، ۳: ۵۶۸۔

۴- غزوۂ بنی قینقاع ۲ھ میں غزوۂ بدر کے بعد، غزوۂ بنی النضیر ۳ھ میں غزوۂ احد کے بعد، غزوۂ بنی قریظہ ۵ھ میں غزوۂ خندق کے بعد اور غزوۂ خیبر ۷ھ میں صلحِ حدیبیہ کے بعد۔

ان چاروں جنگوں کے متعلق قرآن میں اشارات تو ضرور پائے جاتے ہیں لیکن جس اہتمام سے یہاں اہلِ کتاب سے جنگ کا حکم دیا گیا ہے اس اہتمام سے حکم پہلے نہیں دیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ اب یہ کون سی جنگ تھی جس کا اس اہتمام کے ساتھ قرآن نے حکم دیا ہے؟ تاریخی سیاق کو نظر میں رکھیں تو اس سوال کے جواب میں سوائے غزوۂ تبوک کے اور کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ اہلِ کتاب سے جنگ کے حکم کی یہ آیات غزوۂ تبوک کے لیے جانے سے قبل، بلکہ غزوۂ تبوک کے مقصد کے تعین کے لیے، نازل ہوئی تھیں۔ واضح رہے کہ روم کے مسیحیوں اور ان کے عرب حلیفوں کے خلاف جنگ کے لیے تبوک کا سفر رجب ۹ھ میں ہوا تھا۔[۵]

ثالثاً: ان دونوں باتوں سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اہلِ کتاب سے جنگ کے ضمن میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ

۵- رومی سلطنت کے ساتھ مسلمانوں کی کشمکش کیسے شروع ہوئی؟ اس کے اسباب و علل پہ بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ایک بنیادی وجہ بہ ہر حال یہ ہے کہ رومی سلطنت جزیرۃ العرب میں رونما ہونے والی دور رس تبدیلیوں اور ان کے اثرات سے لاتعلق نہیں رہ سکتی تھی، بالخصوص جب کہ عربوں میں پہلے ہی سے روم کے حلیف قبائل کا وجود تھا (بالکل اسی طرح جیسے بعض قبائل دوسری بڑی طاقت فارس کے حلیف تھے)۔ معاہدۂ حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے سرحدی قبائل کے علاوہ، جو روم کے حلیف تھے، قیصر روم کی طرف بھی اپنا ایلچی بھیجا۔ روم کے حلیف قبائل نے رسول اللہ ﷺ کے ایلچی اور وفد کے دیگر ارکان کو قتل کر دیا تھا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی، **سیرت النبی ﷺ** (کراچی: دار الاشاعت، ۱۹۸۵ء)، ۱: ۲۹۱۔) چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے فتحِ مکہ کے بعد جمادی الاولی ۸ھ میں تین ہزار صحابہ کا ایک لشکر اس علاقے کی طرف بھیجا جس کے مقابلے کے لیے عیسائیوں کا تقریباً ایک لاکھ افراد پر مشتمل لشکر آیا اور ساتھ ہی یہ اطلاع بھی ملی کہ خود قیصر روم مزید لشکر کے ساتھ قریب کے علاقے میں موجود ہے؛ تاہم صحابۂ کرام نے موتہ کے مقام پر بے مثال شجاعت اور قربانیوں کی تاریخ رقم کرتے ہوئے اس لشکر عظیم کے دانت کھٹے کر دیے (نفس مرجع، ۲۹۱- ۲۹۳)۔ اس کے بعد آس پاس کے قبائل میں اسلام تیزی سے پھیل گیا اور رومیوں نے محسوس کیا کہ جزیرۃ العرب میں ان کے مفادات کے لیے سخت خطرہ پیدا ہو گیا ہے، چناں چہ اگلے سال قیصر روم نے مسلمانوں کو جنگ موتہ کی سزا دینے کی غرض سے ایک بڑا لشکر تیار کیا اور مدینہ پر حملے کا کام اپنے باج گزار غسانی قبائل کو سونپ دیا۔ یہ اطلاعات موصول ہونے پر رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کیا کہ مدینہ منورہ میں انتظار کرنے کے بجائے آگے بڑھ کر اس خطرے سے نمٹا جائے (نفس مرجع، ۳۲۳)۔ یہ ایک بہت ہی بڑا فیصلہ تھا اور اس کے اثرات بھی بہت دور رس تھے۔ یہی غزوہ تھا جس نے مسلمانوں اور منافقین کے درمیان حدِ فاصل قائم کر دی۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے:

Muhammad Hamidullah, *The Life and Work of the Prophet of Islam* (Islamabad: Islamic Research Institute, 1998), 244-257.

ان سے اس وقت تک لڑیں جب تک وہ جزیہ دینے کی شرط قبول نہ کریں: ﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ﴾ (ان اہل کتاب سے جو نہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نہ اللہ اور اس کے رسول کے حرام ٹھہرائے ہوئے کو حرام ٹھہراتے ہیں، اور نہ دین حق کی پیروی کرتے ہیں، جنگ لڑو یہاں تک کہ وہ جزیہ دینے پر آمادہ ہوں اور ماتحت بن کر رہیں۔)

اس جنگ سے قبل اہلِ کتاب سے معاملے کے لیے جزیے کی شرط لازمی نہیں تھی؛ چناں چہ جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت کی تو کچھ عرصے کے بعد آپ نے یہود کے قبائل کے ساتھ جو معاہدہ کیا وہ جزیے کی شرط کے بغیر تھا۔ پھر جب ان قبائل کی جانب سے عہد شکنی کی گئی تو ان کے خلاف جنگی اقدام بھی کیا گیا لیکن کسی کو بھی جزیہ لے کر نہیں چھوڑا گیا، البتہ خیبر کی فتح کے بعد وہاں کے یہود کو وہاں رہنے دیا گیا اور اس کے ساتھ یہ معاملہ طے پایا کہ وہ نصف پیداوار مسلمانوں کو ادا کریں گے جب تک مسلمان ان کی بے دخلی کا فیصلہ نہ کر لیں۔[۶] فقہاے کرام، خیبر کی اس نظیر پر جزیہ اور خراج کی بحث میں گفت گو ضرور کرتے ہیں،[۷] جو زیرِ نظر مقالے کی حدود سے باہر ہے، لیکن قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ یہودِ خیبر کو اہلِ ذمہ کی حیثیت حاصل نہیں تھی اور اہلِ ذمہ کے برعکس انھیں کسی بھی وقت بے دخل کیا جاسکتا تھا۔[۸]

۶- مثال کے طور پر دیکھیے: شمس الائمۃ ابو بکر محمد بن ابی سہل السرخسی، **المبسوط** (بیروت: دار الکتب العلمیۃ، ۱۹۹۷ء)، ۱۰: ۱۹-۲۰۔

۷- الامام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم الانصاری، **کتاب الخراج** (بیروت: دار المعرفۃ، ۱۹۷۹ء)، ۵۳-۵۴۔

۸- اسلامی قانون کی رو سے غیر مسلموں سے کیے جانے والے امن معاہدات کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں: عقد ذمہ، جو غیر مسلموں کے ساتھ ابدی امن کا معاہدہ ہے اور جس کی رو سے غیر مسلموں کو دار الاسلام میں مستقل اقامت کا حق مل جاتا ہے اور ملکی قانون کی رو سے ان کی جان و مال کو وہی تحفظ حاصل ہو جاتا ہے جو مسلمانوں کے لیے ہوتا ہے اور عقد موادعہ، جو غیر مسلموں کے ساتھ عارضی امن کا معاہدہ ہوتا ہے اور جس کے بعد غیر مسلموں کے خلاف ہر قسم کا جنگی اقدام اس وقت ممنوع ہو جاتا ہے جب تک یہ معاہدہ برقرار رہتا ہے۔ "عارضی" سے مراد یہ نہیں ہے کہ یہ معاہدہ لازماً کچھ مخصوص اور قلیل مدت کے لیے ہو، بلکہ اس معاہدے کی مدت فریقین باہمی رضامندی سے مقرر کر سکتے ہیں اور اگر فریقین چاہیں تو معاہدے میں مدت کی قید سرے سے ذکر ہی نہ کریں۔ پہلی صورت میں اسے موادعۂ موقتہ اور دوسری صورت میں اسے موادعۂ مطلقہ کہتے ہیں۔ اسلامی قانون کی رو سے امن معاہدات پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے: محمد مشتاق احمد، **جہاد، مزاحمت اور بغاوت اسلامی**

رابعاً : امام ابوعبید القاسم بن سلام نے **کتاب الأموال** میں امام مجاہد سے یہ تصریح بھی نقل کی ہے کہ آیتِ جزیہ اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابۂ کرام کو تبوک کی جنگ کا حکم دیا گیا:

نزلت حين أُمِر رسولُ الله ﷺ و اصحابُه بغزوة تبوک. [۹] اس تصریح کے بعد مزید بحث کی گنجایش باقی نہیں رہی۔ تاہم دو اشکالات پر بحث ضروری ہے:

پہلا اشکال یہ ہے کہ روایات میں غزوۂ تبوک سے قبل بھی بعض ایسی مثالیں ملتی ہیں جب رسول اللہ ﷺ نے کسی قبیلے کے ساتھ معاہدہ جزیہ کی شرط پر کیا۔ اس بنا پر جناب عمار خان ناصر کا رجحان اس طرف ہے کہ آیتِ جزیہ کا نزول ۶ ہجری میں ہوا۔ [۱۰]

اس بارے میں عرض یہ ہے کہ جزیہ لینے کا یہ اقدام اس دور کے بین الاقوامی دستور کے موافق اور مصلحت پر مبنی تھا۔ [۱۱] اسی لیے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، بعض اوقات رسول اللہ ﷺ نے اہلِ کتاب سے معاہدہ

شریعت اور بین الاقوامی قانون کی روشنی میں (گوجرانوالہ: الشریعہ اکادمی، ۲۰۱۶ء)، ۲۹۵- ۳۱۷۔ معاہدات سے متعلق قرآنی آیات پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے:

Muhammad Mushtaq Ahmad, "Alliance and Treaties", *The Integrated Encyclopedia of the Qur'an*, eds. Muzaffar Iqbal et al (Canada: Center for Islam and Science, 2012), 1: 185-193.

۹- ابوعبید القاسم بن سلام، **کتاب الأموال** (المنصورة: دار الهدي النبوي، ۲۰۰۷ء)، ۱: ۵۹-۶۰۔

۱۰- برادر مکرم جناب عمار خان ناصر راقم کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: "۷ ہجری میں اہل تیماء نے جزیہ کی ادائی پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صلح کی۔ ۸ ہجری میں اہل طائف نے اسلام قبول کیا تو وہاں کے رہنے والے یہودیوں پر جزیہ عائد کیا گیا۔ ۸ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے علاء بن الحضرمی کو حاکم بحرین منذر بن ساویٰ کے نام جو خط دے کر بھیجا، اس میں یہ بات درج تھی کہ جو مجوسی اسلام قبول نہ کرنا چاہیں، ان سے جزیہ وصول کیا جائے۔ ۸ ہجری ہی میں رسول اللہ ﷺ نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو خط دے کر عمان کی طرف بھیجا جہاں جیفر ابن جلندی اور عباد ابن جلندی حکمران تھے، اور یہاں کے مجوس پر بھی جزیہ عائد کیا گیا۔ ان تمام شواہد کی روشنی میں یہ رائے کہ جزیہ کے عملی نفاذ کا آغاز ۹ ہجری ہی میں ہوا، نظر ثانی اور مزید تحقیق کی متقاضی قرار پاتی ہے۔" واضح رہے کہ راقم کا موقف یہ نہیں ہے کہ جزیہ کے عملی نفاذ کا آغاز ۹ھ میں ہوا، بلکہ یہ ہے کہ ۹ھ میں آیتِ جزیہ کے نزول کے بعد اہلِ کتاب (اور شبہ اہلِ کتاب) سے جب بھی رسول اللہ ﷺ یا آپ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جنگ ختم کی ہے تو اسلام یا جزیہ کی شرط پر ہی ختم کی ہے۔ اس سے قبل یہ پوزیشن نہیں تھی بلکہ کبھی ان سے جزیہ لیا گیا اور کبھی جزیہ لیے بغیر ہی ان کے ساتھ جنگ کا خاتمہ کیا گیا۔

۱۱- خراج اور جزیہ کی روایت عرب کے علاوہ رومی و ایرانی حکومتوں کے تحت بھی رائج تھی۔ بنی اسرائیل کی شریعت میں بھی "غیر

جزیہ کے بغیر بھی کیا۔[۱۲] اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان مواقع پر جزیہ یا خراج کی وصولی کے بعد بھی ان لوگوں کی حیثیت اہلِ ذمہ کی نہیں تھی کیوں کہ ان کے ساتھ معاہدہ ابدی امن کا نہیں ہوا تھا۔[۱۳] یہ بنیادی قانونی فارق ہے اس جزیہ میں جو پہلے وصول کیا گیا اور اس میں جو غزوۂ تبوک کے بعد وصول کیا گیا۔[۱۴] چناں چہ تبوک کی مہم اور اس کے بعد صحابۂ کرام نے اہلِ کتاب سے ہمیشہ اسی شرط پر جنگ لڑی ہے اور جب بھی وہ جزیہ دینے پر آمادہ ہوئے ہیں تو انھیں ذمیوں کی حیثیت دی گئی۔[۱۵] یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ آیتِ جزیہ کا نزول سفر تبوک سے پہلے ہوا اور تبوک کی مہم کا بنیادی محرک اہلِ کتاب سے جنگ کے متعلق سورۃ التوبۃ کی یہ آیات ہی تھیں، چناں

قوموں" سے خراج لینے کے احکام موجود تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اگر آیتِ جزیہ کے نزول سے قبل جزیہ وصول کیا تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں ہے بلکہ مکتبِ فراہی کے منتسبین کی اصطلاح استعمال کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ جزیہ کے اس حکم کی ابتدا قرآن کے بجاے سنت سے ہوئی۔ قرآن نے بعد میں جب جزیہ کا حکم دیا تو اس کی نوعیت مختلف تھی کہ اس کے بعد وہ اہلِ کتاب (اور شبہِ اہلِ کتاب) کے ساتھ جنگ ختم کرنے کی شرط بن گئی۔

۱۲- اوپر میثاقِ مدینہ کی مثال دی گئی ہے۔

۱۳- غزوۂ خیبر کے بعد یہود پر عائد کیے گئے خراج کے باوجود ان کی حیثیت اہلِ ذمہ کی نہیں تھی، چناں چہ انھیں بتا دیا گیا تھا کہ: نقركم ما أقركم الله (ہم تمھیں تب تک یہاں رہنے دیں گے جب تک اللہ چاہے)۔ معاہدے میں اس شق کا مطلب یہی تھا کہ انھیں مستقل اقامت کا حق حاصل نہیں ہے۔ مزید یہ کہ معاہدے میں ان کے لیے شرط رکھی گئی تھی کہ وہ ربا نہیں کھائیں گے ورنہ معاہدہ برقرار نہیں رہے گا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: مشتاق احمد، **جہاد، مزاحمت اور بغاوت**، ۲۹۵-۳۱۰۔

۱۴- جزیہ دراصل خراج ہی کی ایک قسم ہے۔ اس وجہ سے اسے خراج الراس بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ فرد پر عائد ہوتا ہے جبکہ عام خراج زمین پر عائد ہوتا ہے اور اس وجہ سے اسے خراج الارض کہتے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: سرخسی، **المبسوط**، ۱۰: ۷۷-۸۴۔

۱۵- "انسائیکلوپیڈیا آف دی قرآن" کے مقالہ نگار نے "جزیہ" پر بحث میں قرار دیا ہے کہ قرآن کریم کی آیات سے جزیہ کا ذمی کی حیثیت سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔

Paul L. Heck, "Poll Tax", *Encyclopedia of the Qur'an*, eds. Jane Dammen McAuliffe etal (Leiden: Brill, 2003), 5: 151-154

مقالہ نگار دراصل قرآن کے فہم کے لیے سنت کی ضرورت کے قائل نہیں ہیں ورنہ سنت کی روشنی میں قرآن کریم کی آیات کا فہم حاصل کیا جائے تو جزیہ اور ذمہ کا تعلق واضح ہے۔ تفصیل کی گنجائش یہاں نہیں ہے۔ اس تعلق پر تفصیلی بحث ہم ایک اور مقام پر کر چکے ہیں۔ دیکھیے: مشتاق احمد، **جہاد، مزاحمت اور بغاوت**، ۵۸۰- ۶۰۵۔

چہ سفر تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے جب بعض سرحدی قبائل سے جزیہ وصول کیا تھا تو گویا یہ ان آیات کے نفاذ کی پہلی مثال بن گئی۔[۱۶]

دوسرا اشکال جو برادرِ محترم جناب عمار خان ناصرؔ نے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد ۶ھ میں عرب کے پڑوس میں موجود اقوام کے سربراہان کے نام رسول اللہ ﷺ نے جو خطوط لکھے ان میں قیصر روم ہرقل کے نام مکتوب میں عبد اللہ بن شداد رضی اللہ عنہ کی روایت کے بموجب نہ صرف جزیہ کا مطالبہ کیا گیا تھا، بلکہ آیتِ جزیہ بھی نقل کی گئی تھی۔[۱۷] وہ اس کی تائید میں ابن کثیر کی تاریخی روایت بھی نقل کرتے ہیں جس میں ہرقل اپنے مشیروں سے پوچھتا ہے کہ کیا ہم جزیہ دینے کا مطالبہ قبول کر لیں؟

اس سلسلے میں عرض ہے کہ **صحیح بخاری** کی روایت میں نہ جزیے کا مطالبہ کیا گیا ہے نہ ہی آیتِ جزیہ نقل کی گئی ہے۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ ۶ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے قیصر کے سوا جن دیگر بادشاہوں کے نام خط لکھے ان میں کسی میں بھی جزیہ کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔[۱۸] تاہم اگر جزیہ کا مطالبہ کیا بھی گیا ہو تو اس مطالبے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے قبل آیتِ جزیہ کا نزول ہوا ہو کیوں کہ، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، جزیہ اس وقت کے بین الاقوامی عرف کے مطابق ایک معلوم اور معروف چیز تھی؛ البتہ ہرقل کے نام خط میں اگر آیتِ جزیہ کا ذکر ہو تو یہ اہم اشکال ہے۔ تاہم تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشکال بھی وزن نہیں رکھتا۔

ایک تو، جیسا کہ ذکر کیا گیا، امام بخاری نے اس خط کے متعلق جو روایت نقل کی ہے اس میں آیتِ جزیہ کا ذکر نہیں ہے۔ اس روایت کی رو سے خط کا متن یہ تھا:

"بسم الله الرحمٰن الرحيم. من محمد رسول الله إلى هرقل عظيم الروم. سلام على من اتبع الهدى. أما بعد، فإني أدعوك بدعاية الإسلام. و أسلِم، تسلَم. أسلِم، يؤتك الله

۱۶- تفصیل کے لیے دیکھیے: شبلی ندوی، مرجع سابق، ۱: ۳۲۳- ۲۳۴۔

۱۷- اس روایت کے الفاظ اس طرح ہیں: "فإن لم تدخل في الإسلام ، فأعط الجزية؛ فإن الله تبارک وتعالى يقول: ﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ﴾ ابو عبید، **کتاب الأموال**، ۱: ۶۲- ۶۳۔

۱۸- ان مکاتیب کی تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد حمید اللہ، **مجموعة الوثائق السياسية للعهد النبوي و الخلافة الراشدة** (بیروت: دار النفائس، ۱۹۸۷ء)۔

أجرک مرتین. فإن تولیت، فعلیک إثم الأریسین ﴿ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْــًٔا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴾[۱۹] یہی اس خط کے متن کے بارے میں مستند ترین روایت ہے اور اس کی تائید اس مخطوطے سے بھی ہوتی ہے جس پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ (م ۲۰۰۲ء) نے تحقیق کی۔[۲۰]

مزید برآں، حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ / ۱۴۴۹ء) نے دونوں روایات پر تحقیق کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہرقل کو دو دفعہ خط لکھا ہے: ایک دفعہ صلح حدیبیہ کے دوران، جب ابو سفیان رضی اللہ عنہ روم میں ہی تھے اور ہرقل نے انھیں بلا کر رسول اللہ ﷺ کے بارے میں تفصیلات طلب کی تھیں؛ اور دوسری دفعہ غزوۂ تبوک کے وقت آپ نے ہرقل کو خط لکھا۔[۲۱] حافظ ابن حجر کی رائے یہ ہے کہ جس روایت میں آیتِ جزیہ کا ذکر ہے وہ دوسرا خط تھا جو غزوۂ تبوک کے موقع پر ہرقل کو بھیجا گیا تھا۔ یہی بات قرینِ قیاس بھی ہے۔

پس یا تو یہ ماننا چاہیے کہ جس روایت میں آیتِ جزیہ کا ذکر ہے وہ راوی کا ادراج ہے،[۲۲] یا حافظ ابن حجر کی رائے مان لینی چاہیے کہ یہ دوسرا خط تھا جو غزوۂ تبوک کے موقع پر لکھا گیا۔ نتیجہ دونوں صورتوں میں یہ نکلتا ہے کہ

۱۹- ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری، **الجامع الصحیح**، کتاب الجهاد و السیر، باب دعاء النبي ﷺ الناس إلی الإسلام و النبوة...الخ (قاہرہ: المطبعة السلفیة، ۱۴۰۳ھ)، ۲: ۳۴۴، رقم: ۲۹۴۱۔

۲۰- تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد حمید اللہ، **مجموعة**، ۱۰۷- ۱۱۱۔ نیز دیکھیے:

Hamidullah, *The Life and Works of the Prophet of Islam*, 248-49.

۲۱- حافظ ابن حجر کی اس حدیث اور اس کے متعلقات پر تفصیلی تحقیق کے لیے دیکھیے: **فتح الباري بشرح صحیح البخاری** (بیروت: المکتبة السلفیة، ت۔ن)، ۱: ۳۱-۴۵۔ حمید اللہ کی تحقیق بھی یہی ہے کہ جس مکتوب میں جزیہ کا ذکر ہے وہ دوسرا مکتوب تھا جو غزوۂ تبوک کے سفر میں رسول اللہ ﷺ نے قیصر کے نام بھیجا۔ **مجموعة الوثائق السیاسیة**، ۱۰۷- ۱۱۱۔ نیز دیکھیے:

The Life and Works of the Prophet of Islam, 252-253.

۲۲- کبھی راوی سند میں کچھ ایسی بات بیان کرتا ہے جو اصل سند میں نہ ہو، اور کبھی متن میں کچھ ایسا اضافہ ذکر کر دیتا ہے جو اصل متن کا حصہ نہ ہو مگر اسے متن سے الگ کرنے کی کوئی ظاہری صورت نہ ہو۔ اس اضافے کو ادراج اور ایسی روایت کو مُدرَج کہتے ہیں۔ مثلاً قاضی شریک بن عبد اللہ حدیث کی املا کروا رہے تھے اور سند بیان ہی کی تھی کہ اتنے میں ثابت بن موسیٰ

اس مکتوب کی وجہ سے آیتِ جزیہ کے نزول کو ۶ھ میں نہیں مانا جاسکتا۔ خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اہلِ کتاب سے حتمی جنگ کا اعلان جن آیات میں کیا گیا ان کا نزول سفر تبوک (رجب ۹ھ) سے کچھ قبل ہوا اور یہی آیات غزوۂ تبوک کے لیے محرک بنیں۔

واللہ تعالیٰ أعلم بالصواب، و إليه المرجع و المآب.

فصلِ دوم

سورۃ التوبۃ کے دوسرے حصے کا زمانۂ نزول

سورۃ التوبۃ کی جن آیات کو مولانا مودودی اس سورت کا دوسرا حصہ قرار دیتے ہیں اس کے زمانۂ نزول کے متعلق وہ فرماتے ہیں: "دوسری تقریر رکوع ۶ کی ابتدا (آیت ۳۸) سے رکوع ۹ کے اختتام (آیت ۷۲) تک چلتی ہے اور یہ رجب ۹ھ یا اس سے کچھ پہلے نازل ہوئی، جب کہ نبی ﷺ غزوۂ تبوک کی تیاری کر رہے تھے۔"[۲۳] ہم مولانا تھانوی کی یہ رائے بھی نقل کر چکے ہیں کہ "اول آیات ترغیب غزوۂ تبوک کی **اِنْفِرُوْا خِفَافًا**

آگئے۔ ان کو دیکھ کر قاضی شریک نے کہا "من كثرت صلاته بالليل حسن وجهه بالنهار." (جس نے رات کے وقت کثرت سے نماز پڑھی، دن کے وقت اس کا چہرہ حسین ہو گا۔) قاضی شریک نے دراصل ثابت بن موسیٰ کے کثرت قیام اللیل کی وجہ سے ایسا کہا تھا لیکن ثابت اسے حدیث کا متن سمجھ بیٹھے۔ اسی طرح آغاز وحی کے متعلق روایت میں آتا ہے کہ "كان النبي ﷺ يتحنث في غار حراء. وهو التعبد الليالي ذوات العدد." (نبی ﷺ غار حرا میں کئی راتیں تحنث، جس سے مراد تعبد ہے، کرتے تھے۔) یہاں وهو التعبد کے الفاظ امام زہری کے ادراج کے نتیجے میں اضافہ ہوئے ہیں۔ (محمود الطحان، **تیسیر مصطلح الحدیث** (ریاض: مکتبۃ المعارف، ۱۴۳۱ھ / ۲۰۱۰ء)، ۱۳۰- ۱۳۲) مولانا اصلاحی کا کہنا ہے کہ **صحیح بخاری** کی جس روایت میں سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات کو پہلی وحی قرار دیا گیا ہے، اس میں بھی اصل روایت صرف اقرأ باسم ربک تک تھی اور اس سے مراد یہ تھی کہ آپ ﷺ نے اپنے رب کے نام کے ساتھ یہ پیغام لوگوں کو سنانا ہے۔ وہ آگے اقرأ باسم ربک الذي خلق اور دیگر چار آیات کے ذکر کو راوی کا ادراج کہتے ہیں۔ (امین احسن اصلاحی، **تدبر حدیث**، **شرح صحیح بخاری** (لاہور: ادارۂ تدبر قرآن و حدیث، ۲۰۰۲ء)، ۱: ۲۹۔)

اگر یہ مکتوب واقعی ۹ھ سے پہلے لکھا گیا ہو جب ابھی آیتِ جزیہ کا نزول نہیں ہوا تھا تو پھر اس کی اس روایت میں بھی اسی قسم کا ادراج ہوا ہو گا۔ واللہ اعلم۔

۲۳- مودودی، **تفہیم القرآن**، ۲: ۱۶۶۔

وَّثِقَالًا الخ یعنی مع سیاق و سباق کے نازل ہوئیں۔ پھر بعد واپسی تبوک کے اور آیتیں، یعنی آخر کی آیتیں جن میں تخلف تبوک پر ملامت عتاب ہے، نازل ہوئیں۔"[۲۴] گویا وہ بھی سورت کے باقی حصے کو دو ٹکڑوں۔ قبل تبوک و بعد تبوک۔ میں منقسم مانتے ہیں۔

یہ رائے اس اجمال کے ساتھ صحیح نہیں لگتی۔ اس حصے کی آیات پر تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات بھی ایک سے زائد ٹکڑوں میں نازل ہوئی ہیں اور ان ٹکڑوں میں کئی ایسے ہیں جو سفر تبوک کے دوران میں قبل از رجوع الی المدینہ نازل ہوئے ہیں۔

پہلا ٹکڑا: قبل از سفر تبوک نازل ہونے والی آیات

چناں چہ آیات ۳۸ تا ۴۲ واضح طور پر قبل از سفر تبوک نازل ہوئی ہیں جب مسلمانوں کو جہاد کے لیے ترغیب دی جارہی تھی اور عذر تراشنے والے منافقین کی توبیخ کی گئی:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ۭ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـــًٔا ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۭ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴾

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا گیا کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو تم زمین سے چمٹے جاتے ہو! کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا؟ پس دنیا کی زندگی کا یہ سامان تو آخرت میں بہت ہی تھوڑا نکلے گا۔ اگر تم نہیں اٹھو گے تو اللہ تمھیں بڑی دردناک سزا دے گا اور تمھاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور تم اللہ کو کچھ ضرر نہ پہنچا سکو گے اور اللہ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے۔ اگر تم رسول کی مدد نہیں کرو گے تو جان رکھو کہ اللہ نے اس وقت بھی اس کی مدد کی جب کافروں نے اسے اس حالت میں نکال دیا تھا جب وہ صرف دو میں سے دوسرا تھا جس وقت کہ وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا: تم غم نہ کرو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اس وقت اللہ نے اس پر سکونِ قلب نازل کیا اور اس کی مدد ایسے لشکروں کے ذریعے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور کافروں کی بات نیچی کر دی اور اللہ ہی کا بول بالا ہے اور اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ نکلو، خواہ ہلکے ہو یا بوجھل اور جہاد کرو اپنے مالوں اور اپنی جانوں

۲۴۔ مولانا اشرف علی تھانوی، **بیان القرآن** (لاہور: ادارۂ تالیفات اشرفیہ، ۱۴۲۵ھ)، ۱: ۱۰۷۔

کے ساتھ اللہ کی راہ میں؛ یہی تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔ اے رسول! اگر کچھ آسانی سے ملنے والا فائدہ ہوتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ تمھارے پیچھے چلنے پر آمادہ ہو جاتے، لیکن انھیں تو مسافت ہی دور دراز معلوم ہوئی! اور اب وہ اللہ کی قسم کھا کھا کر کہیں گے کہ اگر ہمارے بس میں ہوتا تو ہم یقیناً تمھارے ساتھ چلتے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں اور اللہ تو جانتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔)

مولانا تھانوی نے آیات کے اس مجموعے کو "ملامت بر کسل و ترہیب بر ترک غزوۂ تبوک"، "عدم توقف منصوریت رسول اللہ ﷺ بر ناصریت کسے بضمن قصۂ ہجرت" اور "امر بغزوہ و ترغیب" کے عناوین دیے ہیں جو نہایت معنی خیز ہیں۔[۲۵]

دوسرا ٹکڑا: تبوک کی طرف سفر کے دوران میں نازل ہونے والی آیات

تاہم آیت ۴۳ تا ۹۶ کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفر تبوک کے دوران میں نازل ہوئی ہیں۔ اس کے قرائن یہ ہیں:

اولاً: آیت ۴۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان سفر پر روانہ ہو چکے تھے اور منافقین پیچھے رہ گئے تھے: ﴿وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ﴾ (اگر واقعی ان کا ارادہ جانے کا ہوتا تو وہ اس کے لیے کچھ تیاری تو کرتے لیکن اللہ کو ان کا اٹھنا ناپسند ہوا، اس لیے اس نے انھیں سست کر دیا اور کہا گیا کہ بیٹھ رہو بیٹھنے والوں کے ساتھ۔)

ثانیاً: یہی بات اگلی آیت ۴۷ سے بھی معلوم ہوتی ہے: ﴿لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ﴾ (اگر وہ تمھارے ساتھ نکلتے تو تمھارے اندر خرابی کا ہی اضافہ کرتے اور تمھارے درمیان فتنہ انگیزی کے لیے ہی دوڑ دھوپ کرتے۔ اب بھی تم میں کچھ ان کے لیے جاسوسی کرنے والے ہیں؛ اور اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔)

ثالثاً: آیت ۸۳ میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے کہ مسلمان ابھی سفر تبوک سے واپس مدینہ منورہ نہیں پہنچے تھے[۲۶]: ﴿فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَاۗىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا

۲۵- نفس مرجع، ۱۲۷- ۱۲۹۔

۲۶- مولانا اصلاحی آیات ۸۱ تا ۸۹ کے متعلق کہتے ہیں: "یہ آیات عین میدان جنگ میں نازل ہوئیں۔" (اصلاحی، **تدبر قرآن**، ۳: ۶۱۴۔) آگے کہتے ہیں: "اس آیت کے اسلوب بیان سے ایک تو یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ آیتیں تبوک کے سفر کے دوران ہی

وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِیَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِیْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِیْنَ﴾ (پس اگر اللہ تمھیں ان کے کسی گروہ کی طرف واپس لے جائے اور وہ تم سے جہاد کے لیے نکلنے کی اجازت مانگیں تو کہہ دو: تم کبھی میرے ساتھ نہیں نکل سکو گے اور نہ ہی میرے ساتھ کبھی دشمنوں سے لڑ سکو گے؛ تم پہلے بیٹھ رہنے پر خوش تھے، سو اب بھی پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھ رہو۔)

رابعاً: آیت ۹۴ سے بھی صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کے نزول کے وقت مسلمان ابھی مدینہ منورہ واپس نہیں پہنچے تھے: ﴿یَعْتَذِرُوْنَ اِلَیْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَیْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَسَیَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (یہ لوگ عذر پیش کریں گے جب تم ان کے پاس واپس جاؤ گے؛ کہہ دینا: بہانے نہ کرو؛ ہم کبھی تمھاری بات کا اعتبار نہیں کریں گے؛ اللہ ہمیں تمھارے حالات سے آگاہ کر چکا ہے؛ آئندہ اللہ تمھارا عمل دیکھے گا، اور اس کا رسول بھی؛ پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو پوشیدہ و آشکارا سب کا جاننے والا ہے تو وہ تمھیں بتادے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔)

خامساً: آیت ۹۵ میں اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں تصریح کی گئی ہے: ﴿سَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَیْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ۙ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ﴾ (وہ تمھارے سامنے اللہ کی قسمیں کھائیں گے، جب تم ان کے پاس واپس پہنچو گے، تاکہ تم ان سے صرفِ نظر کرو؛ پس انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دو؛ وہ گندگی ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے ان کے ان کاموں کے بدلے میں جو وہ کرتے رہے ہیں۔)

ان امور کی بنا پر زیادہ صحیح موقف یہ ہے کہ آیات ۴۳ تا ۹۶ سفر تبوک کے دوران میں نازل ہوئی ہیں۔ متعدد قرائن کی بنا پر معلوم یہ ہوتا ہے کہ آیات ۴۳ تا ۷۲ تبوک کی جانب سفر کے دوران میں نازل ہوئیں، جب کہ آیات ۷۳ تا ۹۶ تبوک سے واپسی پر مدینہ منورہ پہنچنے سے قبل نازل ہوئیں۔

تیسرا ٹکڑا: تبوک سے واپسی پر مدینہ منورہ پہنچنے سے قبل نازل ہونے والی آیات

آیات ۷۳ تا ۹۶ کے بعد از تبوک و قبل از وصول الی المدینہ نازل ہونے کے دلائل یہ ہیں:

نازل ہوئی ہیں؛ اس لیے کہ فرمایا ہے کہ اگر تمھیں خدا لوٹائے، جو واضح قرینہ اسی بات کا ہے کہ اس سفر سے لوٹائے۔" (نفس مصدر، ۳: ۲۱۸۔)

اولاً: آیت ۷۳ میں رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے منافقین کے ساتھ سخت رویہ اپنانے کا حکم فرمایا گیا ہے اور حکم کی شدت اس کی متقاضی ہے کہ یہ حکم نسبتاً بعد کے دور میں نازل ہوا ہو، نیز اس کا اسلوب بھی بالکل واضح طور پر نئے سلسلۂ بیان کا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾ (اے نبی! کفار اور منافقین کے خلاف جہاد کرو اور پر سختی کرو؛ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔)

ثانیاً: آیت ۷۴ میں جس سازش کی طرف اشارہ ہے وہ روایات کے بموجب تبوک سے واپسی میں ہی پیش آیا تھا[۲۷]: ﴿يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ۭ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ﴾ (یہ لوگ اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ انھوں نے وہ بات نہیں کہی، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے کفر کی بات کہی ہے اور انھوں نے اپنے اسلام کے بعد کفر کیا اور انھوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جو یہ کر نہیں سکے۔ یہ انھوں نے صرف اسی بات کا بدلہ دیا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے انھیں اپنے فضل سے غنی کر دیا۔ اب اگر یہ اپنی روش سے باز آجائیں تو یہی ان کے لیے بہتر ہے؛ اور اگر یہ روگردانی کریں گے تو اللہ انھیں دنیا و آخرت میں بڑا دردناک عذاب دے گا؛ اور زمین میں کوئی بھی ان کا حمایتی اور مددگار نہیں ہے۔)

ثالثاً: اس کے بعد آیت ۸۰ میں رسول اللہ ﷺ کو منافقین کے لیے استغفار سے منع فرمایا گیا ہے اور ان کو کفر کا مرتکب قرار دیا گیا ہے۔ اس حکم کی شدت یقیناً اس بات کی متقاضی ہے کہ یہ نسبتاً بعد کے دور میں نازل ہوا ہو: ﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ (تم ایسے لوگوں کے لیے معافی کی درخواست کرو یا نہ کرو، اگر تم ستر بار ان کے لیے معافی کی درخواست کروگے تب بھی اللہ ہرگز

۲۷- سفر تبوک سے واپسی کے سفر میں بعض منافقین نے رسول اللہ ﷺ کے قتل کی سازش کی تھی۔ اس آیت میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ (ابو الفرج جمال الدین عبد الرحمان بن علی بن محمد الجوزی، **زاد المسير في علم التفسير** (بیروت: المكتب الإسلامي، ۲۰۰۲ء)، ۵۹۵۔) واقعے کی تفصیل کے لیے دیکھیے: صفی الرحمٰن مبارک پوری، **الرحيق المختوم** (لاہور: المكتبة السلفية، ۱۹۹۴ء)، ۶۹۷- ۶۹۸۔

انھیں معاف نہیں کرے گا؛ یہ اس لیے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے؛ اور اللہ ایسے عہد شکن لوگوں کو راستہ نہیں دکھاتا۔)

رابعاً: اس کے بعد آیت ۸۱ ومابعد میں پیچھے چھوڑے گئے لوگوں (اَلْمُخَلَّفُونَ) کی طرف رخ کیا گیا ہے اور سفر تبوک سے واپسی پر ان کے ساتھ جو رویہ مسلمانوں کو اپنانا تھا اس کا اعلان کیا گیا ہے۔

خامساً: آیت ۸۴ میں منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے سے بھی منع فرمایا گیا ہے اور جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، اس حکم کی شدت اس کی متقاضی ہے کہ اس کا نزول بعد میں ہوا ہو، نیز اس سے قبل کی آیت ۸۳ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔

سادساً: جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، آیات ۸۳، ۹۴ اور ۹۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ابھی واپس مدینہ پہنچے نہیں تھے گو کہ واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔

پس آیات ۸۳ تا ۹۶ واضح طور پر سفر واپسی کے آخری مرحلے میں نازل ہوئی ہیں اور چوں کہ مخلفین کے متعلق یہ سلسلۂ بیان آیت ۸۱ سے شروع ہوتا ہے اس لیے ماننا پڑتا ہے کہ آیات ۸۱ و ۸۲ بھی اسی مرحلے کی آیات ہیں۔

فصلِ سوم

سورۃ التوبۃ کے تیسرے حصے کا زمانۂ نزول

مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ سورت کا جو تیسرا حصہ ہے۔ اس کے زمانۂ نزول کے متعلق کہتے ہیں:

تیسری تقریر رکوع ۱۰ (آیت ۷۳) سے شروع ہو کر سورت کے ساتھ ختم ہوتی ہے اور یہ غزوۂ تبوک سے واپسی پر نازل ہوئی۔ اس میں متعدد ٹکڑے ایسے بھی ہیں جو مختلف ایام میں مختلف مواقع پر اترے اور بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارۂ الٰہی سے ان کو یکجا کر کے ایک سلسلۂ تقریر میں منسلک کر دیا۔ مگر چونکہ وہ ایک ہی مضمون اور ایک ہی سلسلۂ واقعات سے متعلق ہیں اس لیے ربط تقریر میں کہیں خلل نہیں پایا جاتا۔[۲۸]

جیسا کہ ہم نے اوپر واضح کیا، آیات ۷۳ تا ۹۶ سفر تبوک کے دوران میں ہی نازل ہوئی ہیں۔ اگر "غزوۂ تبوک سے واپسی پر" نازل ہونے سے مولانا مودودی کی مراد "واپسی کے دوران میں" نازل ہونا ہے تو یہ بات صحیح

۲۸۔ مودودی، **تفہیم القرآن**، ۲: ۱۶۶۔

ہے، تاہم اگر مراد یہ ہے کہ یہ آیات واپسی کے بعد نازل ہوئی ہیں تو، جیسا کہ ہم نے واضح کیا، یہ بات درست تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ البتہ آیات ۹۷ تا اختتامِ سورت کے متعلق ہماری رائے بھی یہی ہے کہ یہ واپسی کے بعد نازل ہوئی ہیں اور چار ٹکڑوں میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلا ٹکڑا: اہلِ مدینہ اور اہلِ بادیہ کے مومنین و منافقین کے متعلق فیصلہ

ان میں آیات ۹۷ تا ۱۱۶ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفر سے واپسی کے فوراً بعد نازل ہوئی ہیں، کیوں کہ ان میں اہل مدینہ اور اس کے گرد و نواح میں رہنے والے بدوؤں کے مختلف گروہوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ سنایا گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے سفر سے واپسی کے فوراً بعد اس فیصلے کو نافذ فرمایا ہے۔ چناں چہ بعض صحابۂ کرام جو پیچھے رہ گئے تھے اور جنھوں نے خود کو مسجد کی ستونوں سے باندھ لیا تھا ان کا فیصلہ، جو آیات ۱۰۲ تا ۱۰۵ میں مذکور ہے، بھی آپ نے واپسی کے بعد سنا دیا۔[۲۹] نیز تین صحابہ کرام کو بموجب آیت ۱۰۶ رسول اللہ ﷺ نے بتا دیا کہ ان فیصلہ وقتی طور پر مؤخر کر دیا گیا ہے۔[۳۰] اسی طرح مسجد ضرار، جسے گرانے کا حکم آیات ۱۰۷ تا ۱۱۰ میں دیا گیا ہے، کو رسول اللہ ﷺ نے واپسی کے فوراً بعد گرا دیا تھا۔[۳۱] آیات ۱۱۳ تا ۱۱۵ میں مشرکین کے لیے استغفار کی ممانعت کا حکم بھی اسی دور سے مناسبت رکھتا ہے کیوں کہ اس کے چند ہی دنوں یا ہفتوں بعد مشرکین سے آخری اعلان براءت کی آیات (آیات ۱ تا ۶، ۲۳ تا ۲۸ اور ۳۵ تا ۳۶) کا نزول ہوا، جیسا کہ ہم ابتدا میں واضح کر چکے ہیں۔ آیت ۱۱۶ واضح طور پر اس ٹکڑے کی اختتامی آیت ہے۔

۲۹- سیدنا ابولبابہ رضی اللہ عنہ اور ان کے چھ ساتھی (اور شاید چند دیگر صحابۂ کرام) غزوۂ تبوک کے لیے نہیں جاسکے تھے لیکن انھوں نے جھوٹے عذر تراشنے کے بجاے خود کو مسجد کی ستونوں کے ساتھ باندھ لیا اور اپنی تقصیر کا اعتراف کر لیا۔ ان آیات میں ان کی توبہ کی قبولیت کا اعلان ہے۔ (ابو جعفر محمد بن جریر الطبری، **جامع البیان عن تأویل آي القرآن**، تحقیق، محمود محمد شاکر (قاہرہ: مکتبة ابن تیمیة، س ن)، ۱۴: ۴۴۶- ۴۵۳۔)

۳۰- یہ تین صحابہ کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن الربیع رضی اللہ عنہم تھے جو مخلصین میں سے تھے، لیکن تبوک کے موقع پر پیچھے رہ گئے تھے اور واپسی پر بھی ان کا فیصلہ مؤخر کر دیا گیا۔ کعب رضی اللہ عنہ کی روایت میں انتہائی پر اثر انداز میں تفصیل سے یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ کیسے ان پر زندگی تنگ ہو گئی اور کیسے انھوں نے خلوص دل سے توبہ کی جسے اللہ تعالیٰ نے بالآخر قبول کر لیا۔ (نفس مصدر، ۴۶۴- ۴۶۷)

۳۱- شبلی ندوی، **سیرت النبی ﷺ**، ۱: ۳۲۵۔

دوسرا ٹکڑا: تین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی توبہ کی قبولیت کا اعلان

ان آیات کے نزول کے کچھ عرصے بعد آیات ۱۱۷ تا ۱۲۲ کا نزول ہوا جن میں نہ صرف ان تین صحابۂ کرام کی توبہ کی قبولیت کا اعلان ہوا جن کا فیصلہ آیت ۱۰۶ کے تحت وقتی طور پر مؤخر کر دیا گیا تھا، بلکہ مہاجرین و انصار کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا بھی خصوصی اظہار کیا گیا۔ سیدنا کعب رضی اللہ عنہ کی روایت کے بموجب ان آیات کا نزول پچاس دن بعد ہوا۔[۳۲] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حصے کا نزول رمضان ۹ھ کے اواخر میں ہوا۔

تیسرا ٹکڑا: عود علی البدء کے اسلوب پر کفار کے خلاف جہاد کے حکم کی تاکیدِ مزید

آیات ۱۲۳ تا ۱۲۷ میں مومنوں کو حکم دیا گیا کہ اپنے قریب کے کفار سے پوری شدت کے ساتھ جنگ کرو۔ اس سلسلے میں منافقین کو آخری تنبیہات بھی کی گئیں۔ یہاں پہلا سوال یہ ہے کہ آیت ۱۲۳ میں "قریب کے کفار" سے مراد کون ہیں؟ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، لڑو ان کافروں سے جو تمھارے قریب ہیں اور چاہیے کہ وہ تم میں سختی پائیں۔ اور جان لو کہ اللہ تقوی والوں کے ساتھ ہے۔)

مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے منافقین مراد لیے ہیں۔ چناں چہ فرماتے ہیں:

> اگر آگے کے سلسلۂ کلام کے ساتھ ملا کر اس آیت کو پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کفار سے مراد وہ منافق لوگ ہیں جن کا انکارِ حق پوری طرح نمایاں ہو چکا تھا اور جن کے اسلامی سوسائٹی میں خلط ملط رہنے سے سخت نقصانات پہنچ رہے تھے۔ رکوع ۱۰ کی ابتدا میں بھی جہاں سے اس سلسلۂ تقریر کا آغاز ہوا تھا پہلی بات یہی کہی گئی تھی کہ اب ان آستین کے سانپوں کا استیصال کرنے کے لیے باقاعدہ جہاد شروع کر دیا جائے۔ وہی بات اب تقریر کے اختتام پر تاکید کے لیے پھر دہرائی گئی ہے تاکہ مسلمان اس اہمیت محسوس کریں اور ان منافقوں کے معاملے میں ان نسلی و نسبی اور معاشرتی تعلقات کا لحاظ نہ کریں جو ان کے اور ان کے درمیان وابستگی کے موجب بنے ہوئے تھے۔ وہاں ان کے خلاف "جہاد" کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ یہاں اس سے شدید تر لفظ "قتال" استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ان کا پوری طرح قلع قمع کیا جائے، کوئی کسر ان کی سرکوبی میں اٹھا نہ رکھی جائے۔[۳۳]

یہ نہایت ہی تعجب انگیز بات ہے کیوں کہ قرآن کریم نے یہاں قتال کا صیغہ استعمال کیا ہے، جب کہ منافقین کے خلاف قتال کا حکم قرآن و سنت میں کہیں بھی وارد نہیں ہوا۔ یہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں لفظ

۳۲۔ مبارک پوری، مرجع سابق، ۶۹۹۔ ۷۰۰۔

۳۳۔ مودودی، مرجع سابق، ۲: ۲۵۲۔

جہاد اور اس کے مشتقات کبھی اپنے وسیع مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں اور کبھی قتال کے مخصوص مفہوم میں، لیکن قتال اور اس کے مشتقات کہیں بھی جہاد کے وسیع مفہوم میں مستعمل نہیں ہوئے۔

مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ان بعض اہل تصوف کی رائے سے مشابہ ہے جنھوں نے اپنے مخصوص طرز استدلال کی بنیاد پر یہاں یہ استنباط کیا ہے کہ انسان کا قریب ترین دشمن اس کا نفس ہے اس لیے اسے سب سے پہلے نفس سے ہی لڑنا چاہیے۔ اس استنباط کی صحت اور عدم صحت کی بحث میں پڑے بغیر ہم اس مقام پر صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ جس موقع پر نازل ہوئی اس موقع پر ﴿يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ﴾ کا اشارہ روم کے نصاری کی طرف تھا۔ اس اجمال کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

مولانا اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی مولانا مودودی کی طرح "نسلی و نسبی اور معاشرتی تعلقات" کو ہی تذبذب کا سبب گردانا ہے لیکن انھوں نے یہ رائے اختیار کی ہے کہ یہاں مراد وہی مشرکین ہیں جو مسلمانوں کے رشتہ دار تھے اور جن کے ساتھ تعلقات منقطع کرنے میں بعض لوگ تذبذب کا شکار تھے، اسی لیے وہ اس آیت کی تاویل آیات ۲۳-۲۴ کی روشنی میں کرتے ہیں:

> آیات ۲۳۔۲۴ کے تحت یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ منافقین اپنے پاس پڑوس کے کفار و مشرکین سے عزیزانہ و دوستانہ روابط اور دوسرے کاروباری مفادات وابستہ رکھنے کے سبب سے، اس بات کے لیے تیار نہیں تھے کہ ان سے جنگ کریں یا اپنے تعلقات ان سے یک قلم ختم کر لیں۔ ان کی اس منافقت کی اچھی طرح قلعی کھولنے اور ایمان، تقویٰ اور صداقت کے حقیقی مقتضیات تفصیل سے واضح کر دینے کے بعد اب یہ دین کا اصل مطالبہ ان کے سامنے پھر رکھ دیا گیا ہے۔ خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن قرینہ پتہ دے رہا ہے کہ روئے سخن ان ہی کی طرف ہے۔[۳۴]

اس تاویل پر زمانۂ نزول کی تحقیق کے پہلو سے چند امور پیشِ خدمت ہیں:

۱- مولانا اصلاحی کی رائے میں ابتدائی ۱۲ آیات کا نزول صلحِ حدیبیہ کے نقض سے قبل (۸ھ) میں ہوا۔

۲- آیت ۱۳ و مابعد کے متعلق ان کی رائے یہ ہے کہ ان کا نزول صلحِ حدیبیہ کے نقض کے بعد ہوا۔[۳۵]

۳۴- اصلاحی، **تدبر قرآن**، ۳: ۶۶۳۔

۳۵- ان دونوں ٹکڑوں کے زمانۂ نزول پر مولانا اصلاحی کے موقف پر ہم ایک دوسرے مقام پر تفصیلی تنقید کر چکے ہیں۔ دیکھیے: مشتاق احمد "سورۃ التوبۃ کے ابتدائی حصے کا زمانۂ نزول اور تاریخی پس منظر"، ۱۷- ۱۹ و ۲۸- ۴۵۔

۳۔ آگے آیات ۲۳-۲۸ میں چوں کہ غزوۂ حنین کا بھی ذکر ہے اور ایسے احکام ہیں جن کا اعلان ۹ھ کے حج میں کیا گیا (جیسے مشرکین کی مسجدِ حرام میں داخلے کی ممانعت)، اس لیے وہ ان کے زمانۂ نزول کو ۹ھ ہی مانتے ہیں۔ آگے آیات ۳۶-۳۷ کے نزول کو آیات ۲۳-۲۸ کے ساتھ ہی مانتے ہیں اور انھیں ان آیات کا ضمیمہ قرار دیتے ہیں۔

۴۔ اس کے بعد آیات ۳۸-۱۲۲ وہ آیات ہیں جن کا نزول تبوک کے سفر سے قبل، تبوک کے سفر کے دوران میں اور تبوک کے سفر سے واپسی پر ہوا۔

۵۔ اب آخر میں ۱۲۳-۱۲۷ آیات ہیں جنھیں مولانا اصلاحی پھر ان آیات سے متعلق سمجھتے ہیں جو اوپر پیرا ۳ میں مذکور ہیں۔

اب یہاں دو امکانات ہیں: ایک یہ کہ آیات ۱۲۳ تا ۱۲۷ کا نزول آیات ۲۳ تا ۲۸ اور آیات ۳۶-۳۷ کے ساتھ ہوا ہو اور دوسرا یہ کہ ان کا نزول کچھ عرصے بعد ہوا ہو۔

پہلے امکان پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک ساتھ نازل ہونے والی آیات کے مجموعے کو توڑ کر اس کے درمیان میں آیات ۲۹ تا ۳۵ اور پھر ۳۸ تا ۱۲۲ کیوں رکھ دی گئیں جن کا نزول ان آیات سے قبل ہوا تھا؟ واضح رہے کہ مولانا اصلاحی خود آیات ۳۶-۳۷ کو آیات ۱ تا ۲۸ کا ضمیمہ قرار دے چکے ہیں اور کہتے ہیں کہ انھیں اہلِ کتاب کے متعلق احکام والی آیات کے بعد اسی مقصد کے لیے رکھا گیا کہ یہاں تک اعلانِ براءت اپنے ضمیمے سمیت پورا ہو جاتا ہے۔[۳۶] اب اگر آیات ۱۲۳ تا ۱۲۷ کو بھی انھی آیات کے ساتھ نازل شدہ مان لیا جائے تو یہ گویا 'ضمیمے کے بعد ضمیمہ' بن جاتی ہیں! پس نظم کے پہلو سے دوسرا امکان ہی قوی معلوم ہوتا ہے کہ آیات ۱۲۳ تا ۱۲۷ کا نزول آیات ۲۳ تا ۲۸ و ۳۶-۳۷ کے نزول کے کچھ عرصے بعد ہوا ہے۔

تاہم اس دوسرے امکان پر یہ سوال قائم ہوتا ہے کہ دوبارہ یہی حکم دینے کی ضرورت کیا تھی؟ تاریخی طور پر معلوم ہے کہ ۹ھ کے حج کے موقع پر جب اعلانِ براءت مشرکینِ مکہ تک پہنچایا گیا تو ابتدائی طور پر غصے کے اظہار کے بعد وہ بالکل دب گئے اور انھوں نے کوئی عملی مزاحمت نہیں کی جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے وصال تک ان سے لڑنے کا موقع ہی نہیں آیا۔ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ مستقبل میں یہ موقع پیدا ہو سکتا تھا؟ عملاً ہوا بھی یہی جب رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد فتنۂ ارتداد اور مانعینِ زکاۃ کے ساتھ جنگ کا موقع آیا۔

۳۶۔ اصلاحی، **تدبر قرآن**، ۳: ۵۶۸۔

ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ آیات ۲۹ تا ۳۵ میں اہلِ کتاب سے جنگ کا حکم دیا گیا جس کے متعلق تفصیل سے اوپر واضح کیا گیا کہ یہ روم سے جنگ کا حکم تھا اور آگے آیت ۳۸ سے آیت ۱۲۲ تک ساری آیات غزوۂ تبوک سے ہی متعلق ہیں، تو کیا وجہ ہے کہ اب ۱۲۳ تا ۱۲۷ کو غزوۂ تبوک کے بعد روم سے ہی جنگ کے دوسرے مرحلے سے متعلق نہ سمجھا جائے، بالخصوص جب کہ آگے وہ جنگ مسلسل جاری رہنی تھی؟ اس کے ساتھ اس بات کا اضافہ کریں کہ سورت کے ابتدائی حصے میں ساری بحث کا تعلق مشرکین سے ہے، لیکن آیت ۳۸ کے بعد سے اختتامِ سورہ تک مشرکین بالکل پس منظر میں چلے گئے ہیں اور صرف ایک جگہ ان کا واضح ذکر آتا ہے جہاں ان کے لیے استغفار کی ممانعت کی گئی ہے۔ باقی ساری بحث کا تعلق غزوۂ تبوک کے سیاق وسباق میں ہی چل رہی ہے اور غزوۂ تبوک روم اور اہلِ کتاب کے خلاف تھی۔ اس پہلو سے دیکھیں تو آیت ۱۲۳ میں "الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ" کا واضح تعلق آیت ۲۳-۲۴ کے بجائے آیات ۲۹ کے ساتھ بنتا ہے اور شاید اسی وجہ سے بیش تر مفسرین نے اس حکم کو روم کے ساتھ جنگ سے متعلق سمجھا ہے، جیسا کہ ہم آگے حوالہ دیں گے۔

تیسرا اہم پہلو یہ ہے، جو بظاہر ایک ضمنی بحث نظر آتی ہے، لیکن سورت کے ماحول اور اس کے مخصوص تاریخی پس منظر میں اس سوال کی اپنی جگہ بہت اہمیت ہے، کہ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والی آخری آیات کون سی تھیں؟ آگے ہم تفصیل سے واضح کریں گے کہ سورۃ التوبۃ کی آخری دو آیات (۱۲۸-۲۹) ہی آخری نازل ہونے والی آیات ہیں۔ اس لحاظ سے بھی زیر بحث آیات (۱۲۳ تا ۲۷) کے متعلق احساس یہی پیدا ہوتا ہے کہ ان کا نزول ان آخری دو آیات سے بس کچھ ہی عرصہ (بلکہ کچھ دن) قبل ہوا تھا۔ تلاوت کرتے ہوئے بالکل بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ ان آیات کے زمانۂ نزول کے درمیان سوا سال کا فاصلہ ہو!

ان تین امور کی الگ الگ حیثیت شاید کمزور ہو، لیکن باہم مل کر یہ مولانا اصلاحی کے موقف کے خلاف ایک مضبوط دلیل بن جاتے ہیں۔ پھر جب ان کے ساتھ اس آیت کے بعد آنے والی آیات کے شواہد اور ان تفسیری روایات کا اضافہ بھی کیا جائے، جن کا ذکر آگے آرہا ہے، تو یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ آیات ۱۲۳ تا ۱۲۷ کا نزول ۹ھ کے اواخر میں نہیں بلکہ ۱۱ھ کے اوائل میں ہوا۔

جہاد سے جی چرانے کا سبب کیا تھا؟

جناب جاوید احمد غامدی اپنے استاذ مولانا اصلاحی کی رائے پر بنیاد رکھتے ہوئے اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "آیت میں خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن روے سخن اُنھی منافقین کی طرف ہے جو اپنی دوستیوں، رشتہ داریوں

اور کاروباری تعلقات کے پیش نظر اُن لوگوں کے خلاف کسی اقدام کے لیے تیار نہیں تھے جن کے ساتھ اِس سورہ میں جنگ کا حکم دیا گیا ہے۔"[۳۷]

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اس سورت میں کسی ایک گروہ سے نہیں بلکہ دو گروہوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے: مشرکین اور اہلِ کتاب؛ اور منافقین ان دونوں گروہوں سے لڑنے سے جی چرا رہے تھے۔ سورت کی آیات سے واضح ہے کہ ہر دو مقامات پر جہاد سے جی چرانے کا عذر مختلف تھا۔ چناں چہ جسے غامدی صاحب "دوستیوں، رشتہ داریوں اور کاروباری تعلقات" کا عذر کہتے ہیں، یا مولانا مودودی اسے "نسلی و نسبی اور معاشرتی تعلقات" کے عذر سے یاد کرتے ہیں، یہ عذر مشرکین کے ساتھ لڑنے میں مانع تھا اور اسی وجہ سے مولانا اصلاحی نے یہاں سورت کی آیات ۲۳-۲۴ کا حوالہ دیا ہے۔[۳۸] دوسری جانب جب کہ اہلِ کتاب، یعنی رومی سلطنت سے لڑنے میں اصل مانع ان کی طاقت کا خوف تھا جس کے مختلف مظاہر آیات ۳۸ تا ۱۲۲ میں پیش کیے گئے ہیں۔[۳۹] اہم بات یہ ہے کہ اس مقام پر لڑائی میں شرکت سے گریز کا یہی دوسرا سبب معلوم ہوتا ہے۔[۴۰] چناں چہ ارشاد ہوتا ہے:

۳۷- جاوید احمد غامدی، **البیان** (لاہور: المورد، ۲۰۱۸ء)، ۲: ۴۰۳۔

۳۸- ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ (القرآن، ۹: ۲۳-۲۴۔)

۳۹- مثال کے طور پر اس سورت کی درج ذیل آیات ملاحظہ کریں: ﴿اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ﴾ (آیت ۴۵) ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ۭ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ﴾ (آیت ۴۹) ﴿وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ﴾ (آیت ۵۴) ﴿لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ﴾ (آیت ۵۷) ﴿فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ﴾ (آیت ۸۱) ﴿وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ۝ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ﴾ (آیات ۸۶-۸۷)

۴۰- ہم دیگر اسباب، جیسے مال و دولت کی ہوس یا تن آسانی، کی یک سر نفی نہیں کر رہے، بلکہ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بنیادی اور اصل سبب رومیوں کی طاقت کا خوف تھا۔ دیگر اسباب و عوامل کی حیثیت ثانوی تھی۔

﴿وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ﴾

(اور جب کوئی سورہ اترتی ہے تو ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جو پوچھتے ہیں کہ اس نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا؟ سو جو سچ مچ ایمان لائے ہیں وہ ان کے لیے ایمان میں اضافہ کرتی ہے اور وہ اس سے بشارت حاصل کرتے ہیں۔ رہے وہ جن کے دلوں میں روگ ہے تو وہ ان کی نجاست پر ایک اور نجاست کا اضافہ کر دیتی ہے اور وہ کفر ہی کی حالت میں مرتے ہیں۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک بار یا دو بار آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں، پھر بھی نہ تو توبہ کرتے نہ یاد دہانی ہی حاصل کرتے۔ اور جب کوئی سورہ اتاری جاتی ہے تو ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے پھر کھسک جاتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے بوجہ اس کے کہ یہ سمجھ سے کام لینے والے لوگ نہیں ہیں۔)

یہ بعینہ وہی رویہ ہے جو تبوک کے مہم کے دوران میں منافقین کی جانب سے سامنے آیا۔ یہ اس بات کے لیے ایک نہایت اہم قرینہ بن جاتا ہے کہ یہاں اولین مراد اہل کتاب، یعنی رومی نصاریٰ، تھے۔ اسی موقف کی مزید تائید تفسیری روایات سے بھی ہوتی ہے۔

"الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ" کے متعلق تفسیری روایات

امام ابن الجوزی نے اس سلسلے میں پانچ اقوال نقل کیے ہیں: "ایک یہ کہ مراد اہل روم (نصاریٰ) ہیں؛ دوسرا یہ کہ قریظہ، نضیر، خیبر اور اہل فدک (یہود) مراد ہیں؛ تیسرا یہ کہ اہل دیلم (مجوس) مراد ہیں؛ چوتھا یہ کہ عرب (مشرکین) مراد ہیں؛ اور پانچواں یہ کہ آیت کا اطلاق تمام غیر مسلموں پر ہوتا ہے اور ہر علاقے کے مسلمان قریب کے کفار سے لڑیں گے۔"[۴۱]

جہاں تک اس آخری رائے کا تعلق ہے تو وہ اس اصول پر مبنی ہے کہ العبرة لعموم اللفظ، لا لخصوص السبب (اعتبار لفظ کے عموم کا کیا جائے گا، نہ کہ سبب کے خصوص کا)۔[۴۲] سر دست ہم اس اصول

۴۱- جمال الدین الفرج عبدالرحمٰن بن علی بن محمد الجوزی، **زاد المسير في علم التفسير**، ت، عبدالرزاق المہدی (بیروت: دار الكتاب الغربي، ۱۴۲۲ھ)، ۲: ۱۱۳۔

۴۲- اس اصول پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے: محمد تقی عثمانی، **علوم القرآن** (کراچی: مکتبۂ دار العلوم، ۱۳۹۶ھ)، ۸۲ - ۸۶؛ مولانا مودودی اس زاویۂ نظر کی توضیح کرتے ہوئے کہتے ہیں: "آیت کے ظاہر الفاظ سے جو مطلب نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ دار

پر، یا اس مسئلے پر اس اصول کے اطلاق پر، بحث نہیں کر رہے، بلکہ صرف یہ دیکھ رہے ہیں کہ جس وقت ان آیات کا نزول ہوا اس وقت ان الفاظ کے اولین مصداق کون تھے؟ اس لیے ہم پہلے چار امکانات پر بحث کریں گے:

یہود پر ان کے اطلاق کا امکان سب سے کمزور ترین امکان ہے کیوں کہ ۷ھ میں غزوۂ خیبر و فدک کے بعد یہود کی قوت ختم ہو چکی تھی اور مسلمانوں کی ان سے کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ البتہ جب خیبر کے یہود نے بہت عرصے بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں سرکشی شروع کی تو انھیں جزیرۂ عرب سے نکال دیا گیا۔

اسی طرح اوپر پیش کی گئی بحث کی روشنی میں واضح ہے کہ (۱۱ھ میں) ان آیات کے نزول کے وقت مشرکین کی طاقت بالکل ہی ختم ہو چکی تھی کیوں کہ ۹ھ میں اعلانِ براءت کے بعد انھوں نے ابتدائی جذباتی ردعمل کے بعد خاموشی سے بظاہر اسلام قبول کرنے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔[۴۳]

اسی لیے عام طور پر مفسرین نے بحث اس بات پر کی ہے کہ اس آیت کے اولین مصداق اہل روم (نصاری) ہیں یا اہل دیلم (مجوس)؟ رئیس المفسرین امام طبری نے اس مقام پر جو کچھ کہا ہے وہ قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے: "و كان الذين يلون المخاطبين بهذه الآية يومئذٍ الروم لأنهم كانوا سكان الشام يومئذٍ، و الشام كانت أقرب إلى المدينة من العراق."[۴۴] (اس آیت کے نزول کے وقت اس کے مخاطبین کے قریب ترین کفار سے مراد رومی تھے، کیوں کہ وہ اس وقت شام میں رہتے تھے اور مدینہ کے لیے عراق کی بہ نسبت شام زیادہ قریب ہے۔)

انھوں نے سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ ابتدا دیلم سے کی جائے گی یا روم سے؟ تو انھوں نے فرمایا: عليك بالروم (تمھیں روم پر توجہ کرنی چاہیے)۔

الاسلام کے جس حصے سے دشمنانِ اسلام کا جو علاقہ متصل ہو، اس کے خلاف جنگ کرنے کی اولین ذمہ داری اسی حصے کے مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔" (مودودی، **تفہیم القرآن**، ۲: ۲۵۲۔)

۴۳۔ تاہم اس بات کا پورا امکان تھا کہ وہ کسی بھی وقت ارتداد کی روش اختیار کر سکتے ہیں۔ شاید اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی جانب سے اسلام قبول کرتے وقت فرماتے تھے: فقد عصموا منی دماءهم و أموالهم إلا بحق الإسلام و حسابهم على الله. (بخاری، **صحيح البخاري**، كتاب الإيمان، باب فَإِن تَابُواْ وَأَقَامُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُاْ ٱلزَّكَوٰةَ، ۱: ۲۴، رقم: ۲۵۔)

۴۴۔ الطبری، **جامع البیان**، ۱۴: ۵۷۴۔

امام قرطبی نے امام ابن العربی کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کے لیے تین دلائل نقل کیے ہیں کہ اہل روم و اہل دیلم میں ابتدا اہل روم سے کی جائے گی:

اولاً: یہ کہ اہل روم اہل کتاب تھے؛

ثانیاً: یہ کہ وہ مدینہ سے قریب تر تھے؛

ثالثاً: یہ کہ ان کے زیر تسلط انبیاے کرام علیہم السلام کی سرزمین تھی جسے ان کے قبضے سے چھڑانا ضروری تھا۔[۴۵]

جیشِ اسامہ رضی اللہ عنہ کی رونگی

ان دلائل پر اگر اس تاریخی حقیقت کا اضافہ کیجیے کہ رسول اللہ ﷺ نے وفات سے کچھ قبل آخری لشکر اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی قیادت میں اہل روم سے جنگ کے لیے تیار کیا تھا اور سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ جنگ شروع ہوئی، تو بات قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ اس آیت میں اولین مراد اہل روم نصاریٰ ہی تھے اور یہ کہ ان آیات کا نزول جیشِ اسامہ کی تیاری سے کچھ قبل ہوا تھا۔

چناں چہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ذی الحجہ کے باقی دن اور محرم اور صفر کے مہینے مدینہ منورہ میں ہی گزارے اور اسی دوران میں آپ نے لوگوں کو شام پر حملے کی تیاری کے لیے کہا اور سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو اس لشکر کا امیر مقرر کیا۔ علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کی تحقیق یہ ہے کہ ۱۸/ یا ۱۹/ صفر ۱۱ھ کو رات کے وقت جب رسول اللہ ﷺ جنت البقیع سے واپس ہوئے تو آپ کی طبیعت ناساز ہوئی اور یہ آخری علالت کا آغاز تھا اور اس سے ایک دن قبل آپ نے اسامہ رضی اللہ عنہ کو شام پر حملے کی ذمہ داری دی۔ پس سورۃ التوبۃ کی آیات ۱۲۳ تا ۱۲۷ کا نزول صفر ۱۱ھ کی ابتدا میں ہوا۔

ان امور کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان آیات کے نزول کے وقت "**الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ**" کے اولین مصداق اہلِ روم تھے، تاہم جب رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد بعض مشرکین نے ارتداد کی روش اختیار کی اور بعض قبائل نے زکاۃ کی ادائی کا انکار کیا تو وہ بھی اس عنوان کا مصداق بن گئے۔ پھر جب

۴۵- ابو عبد اللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی، **الجامع لأحکام القرآن** (بیروت: مؤسسة الرسالة، ۲۰۰۶ء)، ۱۰: ۴۳۵۔

مجوس کے ساتھ جنگ کا مرحلہ آیا تو اس عنوان کا اطلاق ان پر بھی ہونے لگا۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

چوتھا ٹکڑا: قرآن مجید کی آخری نازل ہونے والی آیات

مولانا ابو الکلام آزاد (م۱۹۵۸ء) بجا طور پر سورۃ التوبۃ اور بالخصوص آخری دو آیات کو کو الوداعی پیغام قرار دیتے ہیں اگرچہ وہ اس کے قائل نہیں ہیں کہ یہی آخری نازل ہونے والی آیات ہیں۔[۴۶] سلف میں کئی ممتاز اہلِ علم کی رائے یہ ہے کہ قرآن کی آخری نازل ہونے والی آیات بھی یہی ہیں اور ہمارے نزدیک یہی قول راجح ہے۔ یہاں اس امر کی کچھ تفصیل دی جاتی ہے۔

قرآن کی آخری نازل ہونے والی آیات کے متعلق امام زرکشی نے پانچ اقوال نقل کیے ہیں جن میں ایک قول علوم القرآن کے حامل صحابی ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے سورۃ التوبۃ کی انھی آیات کے متعلق روایت کیا گیا ہے۔ دیگر چار اقوال یہ ہیں:

- سورۃ النصر کی آیات؛
- سورۃ المآئدۃ کی آیات؛
- سورۃ النسآء کی آخری آیت کلالہ؛ اور
- سورۃ البقرۃ میں آیاتِ ربا کے سلسلے کی آخری آیت و اتقوا یومًا ترجعون فیه إلی الله.[۴۷]

امام زرکشی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بحث کے اختتام پر اہم بات یہ ذکر کی ہے کہ آخری نازل ہونے والی آیات کے متعلق تمام اقوال اجتہاد پر مبنی ہیں اور ان میں کوئی بھی قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً روایت نہیں کیا گیا۔[۴۸] اگر ایسا ہی ہے تو ہمیں کہنے دیجیے کہ ان اجتہادی آرا میں راجح رائے سورۃ التوبۃ کی آخری آیات والی ہی ہے اور اس ترجیح کی بنیاد ان آیات کے داخلی قرائن اور قرآنِ کریم میں ان کا سیاق وسباق ہے۔

۴۶۔ ابو الکلام آزاد، **ترجمان القرآن** (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، س ن)، ۲: ۱۵۷– ۱۵۸۔

۴۷۔ بدر الدین محمد بن عبد اللہ الزرکشی، **البرهان في علوم القرآن** (قاہرہ: دار التراث، ۱۹۵۷ء)، ۱: ۲۶۶– ۲۶۷۔

۴۸۔ نفس مصدر، ۱: ۲۶۸۔

چناں چہ سورۃ النصر کے متعلق تو راجح یہی ہے کہ یہ مکی دور کے آخر میں نازل ہوئی۔ اس سورت کا موضوع اور قرآن مجید میں اس کا مخصوص مقام اسی بات کی گواہی دیتے ہیں۔[۴۹] جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے کہ اس سورت سے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ کے وصال کا اندازہ لگایا تھا تو اس میں مذکور بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو یہ بتایا گیا کہ جب لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوں اور آپ کا مشن تکمیل تک پہنچ جائے تو آپ اپنے رب کی تسبیح اور حمد میں لگ جایئے، تو ترجمان القرآن نے قرآن کا منشا بالکل صحیح سمجھا کہ جب ایسا ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کا وقت آ گیا۔[۵۰] اس روایت سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ اس سورت کا نزول ہی اس موقع پر ہوا، جیسا کہ شانِ نزول کی روایات کے متعلق ہم نے شاہ ولی اللہ اور دیگر محققین کی رائے ایک اور مقام پر تفصیل سے ذکر کی ہے۔[۵۱]

۴۹- امام فخر الدین الرازی (م ۶۰۴ھ / ۱۲۰۷ء) سورۃ النصر کے زمانۂ نزول کے متعلق عام طور پر مشہور قول کے ذکر کے بعد دوسرا قول یہ ذکر کرتے ہیں کہ یہ فتح مکہ کے بعد نہیں بلکہ اس سے قبل نازل ہونے والی سورت ہے جس میں مستقبل کے بارے میں ایسی پیشین گوئی کی گئی جو سچی ثابت ہوئی اور یوں یہ رسول اللہ ﷺ کا ایک اور معجزہ ہوا۔ اس کی نظیر کے طور پر وہ سورۃ القصص کی آیت: إِنَّ ٱلَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ ٱلْقُرْءَانَ لَرَآدُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ (بے شک جس نے تم پر قرآن کی ذمہ داری ڈالی ہے وہ تمھیں ایک اچھے انجام تک پہنچا کے رہے گا) سے استدلال بھی کرتے ہیں جس کے مفہوم میں بیش تر مفسرین نے مکہ مکرمہ کی طرف فاتحانہ واپسی کو شامل سمجھا ہے۔ پھر وہ اس لغوی حقیقت کا ذکر کرتے ہیں کہ جو چیز واقع ہو چکی ہو اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ 'جب وہ واقع ہو' (إذ لا يقال في ما وقع: إذا جاء و إذا وقع)۔ (فخر الدین محمد بن ضیاء الدین الرازی، **مفاتیح الغیب** (بیروت: دار الفکر، ۱۹۸۱ء)، ۳۲: ۱۵۵۔)۔

۵۰- **صحیح بخاری** کی روایت میں سورۃ النصر کے متعلق سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے صحابہ کے ساتھ مکالمے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے جواب سے اتنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ البتہ **صحیح مسلم** کی ایک روایت میں آیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عبید اللہ بن عتبہ سے پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ قرآن کی آخری سورت جو پوری کی پوری بیک وقت نازل ہوئی کون سی ہے؟ انھوں نے جواب میں سورۃ النصر کہا تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تصویب کی۔ تاہم مسلم ہی کی ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مطلقاً سورت کے متعلق پوچھا تھا، نہ کہ آخری سورت کے متعلق۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال و جواب کسی خاص سیاق و سباق میں کیا گیا تھا (مثلاً ہو سکتا ہے کہ یہ مکالمہ چند مخصوص آیات و سور کے متعلق ہو اور اس میں پوچھا گیا ہو کہ ان میں کون سی سورت ایسی ہے جو پوری کی پوری بیک وقت نازل ہوئی) اور اس کا آخری نازل ہونے والی سورت کے مسئلے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

۵۱- تفصیل کے لیے دیکھیے: مشتاق احمد، "سورۃ التوبۃ کے ابتدائی حصے کا زمانۂ نزول اور تاریخی پس منظر: تحقیق مزید"، ۱۱-۱۹۔

اسی طرح سورۃ المآئدۃ کا غالب حصہ صلح حدیبیہ کے بعد عمرۃ القضاء سے قبل نازل ہوا، جیسا کہ سورت کے ابتدائی حصے اور اختتامی حصے[۵۲] سے یقینی طور پر معلوم ہو جاتا ہے۔ جہاں تک اکمالِ دین کی آیت کا تعلق ہے[۵۳]، تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس آیت کا نزول آخری دور میں ہوا، نہ ہی حجۃ الوداع کے موقع پر اس آیت کی تلاوت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت کا نزول اس موقع پر ہوا کیوں کہ اکمالِ دین کی بات جس ٹکڑے میں کی گئی ہے وہ پوری آیت نہیں، بلکہ آیت کا ایک حصہ ہے اور اس حصے کا سیاق و سباق قطعی طور پر یہ ثابت کرتا ہے کہ اس ٹکڑے کا نزول الگ سے نہیں ہوا۔ اسی آیت میں اس ٹکڑے سے قبل بھی اَلْیَوْمَ کا لفظ آیا ہے[۵۴] اور اس کے ایک آیت بعد آیت ۵ میں بھی اَلْیَوْمَ کا لفظ وارد ہوا ہے جس میں اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کی حلت کا ذکر ہے[۵۵] اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ اہلِ کتاب عورتوں کے ساتھ نکاح کی حلت کا حکم ۱۰ھ میں نہیں، بلکہ اس سے پہلے نازل ہوا تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ایک یہودی کے ساتھ مکالمے کی، جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یوم عرفہ ۱۰ھ کو اس آیت کا نزول ہوا،[۵۶] آسان توجیہ، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصول کے مطابق یہ کی جا سکتی ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر علی رؤس الاشہاد اکمالِ دین کا اعلان ۹ ذی الحجہ کو کیا گیا اور ۱۰/ ذی الحجہ کو ہم اس خوشی میں عید مناتے ہیں۔

صحیح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آیتِ کلالہ کا نزول آخری دور میں ہوا اور یہ بات سورۃ النساء کے نظم سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ نزول کے اعتبار سے سورۃ النساء واضح طور پر تین ٹکڑوں میں

۵۲- مثال کے طور پر سورت کی ابتدا میں مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ قریش نے تمھیں مسجد حرام میں داخلے سے روکا تو ان کی یہ حرکت تمھیں ان کے ساتھ زیادتی پر مجبور نہ کر دے (وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا) (آیت ۲)۔ اسی طرح اختتام میں حرم کے قریب شکار کی ممانعت اور دیگر متعلقہ احکام دیے گئے ہیں (دیکھیے: آیات ۸۷-۱۰۳۔)

۵۳- ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾

۵۴- ﴿اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ﴾

۵۵- ﴿اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۖ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾۔

۵۶- اس مکالمے کی روایت کے متعلق تفصیل کے لیے دیکھیے: ابو الحسن علی بن احمد الواحدی، **أسباب نزول القرآن** (بیروت: دار الکتب العلمیۃ، ۱۹۹۱ء)، ۱۹۲- ۱۹۳۔

تقسیم نظر آتی ہے۔ چناں چہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت ۱ سے ۱۲۶ تک ایک ہی موقع پر نازل ہوئیں۔ اس کے بعد آیت ۱۲۷ تک ۱۷۵ کچھ عرصے بعد نازل ہوئیں۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ آیت ۱۲۷ سے ۱۳۴ تک ان سوالات کے جواب دیے گئے ہیں جو سورت کی ابتدائی آیات کے متعلق ذہنوں میں پیدا ہوئے تھے اور اس کے بعد خاتمۂ سورت کی آیات ہیں۔ آخری آیت ۱۷۶ کے متعلق یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ باقی سورت سے الگ کچھ عرصے بعد نازل ہوئی اور اسی لیے سورت کے آخر میں بطور ضمیمہ رکھی گئی۔

تاہم آخری آیت کے طور پر اس کا نزول قرآن مجید کے عام اسلوب کے مطابق نظر نہیں آتا۔ لمبی سورتوں کے نظم کو دیکھیے کہ خاتمۂ سورت کی آیات کا اسلوب کیسا ہوتا ہے؟ خود سورۃ النساء کا آخری حصہ دیکھیے کہ اس کا اسلوب کیسا ہے؟ سورۃ النساء میں خاتمۂ سورت کی آیت کے بعد آیتِ کلالہ آتی ہے جس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں: ایک یہ کہ اس کا نزول نسبتاً بعد میں ہوا اور دوسری یہ کہ اس آیت کی حیثیت ضمیمے اور توضیحِ مزید کی ہے، کیوں کہ اس میں میراث کے اس حکم کی تکمیل اور تفصیل ہے جو آیت ۷ میں مجملاً نازل کیا گیا تھا۔ اسی لیے اس آیت کے آخر میں فرمایا گیا: ﴿يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا﴾ (۵۷) چناں چہ یہ آیت سورۃ النساء کے ضمیمے کے طور پر تو نہایت مناسب ہے، لیکن قرآن کریم کے خاتمے یا ضمیمے کے لیے مناسب معلوم نہیں ہوتی۔

اسی طرح آیات الربا بھی یقیناً آخری دور میں نازل ہوئیں۔ (۵۸) ان آیات کے اختتام پر جو آیت آئی

۵۷- سورۃ النساء، آیت ۱۷۶۔ سورۃ البقرۃ، سورۃ المآئدۃ اور سورۃ النور میں آیاتِ احکام کے ضمن میں قرآن نے یہی اسلوب اپنایا ہے۔

۵۸- ربا کے متعلق ایک تو سورۃ الروم کی آیت ۳۹ ہے جو واضح طور پر مکی ہے اور اس آیت میں ربا کا لفظ نکرہ آیا ہے ﴿وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ﴾۔ پھر ربا کا ذکر سورۃ آل عمران کی آیت ۱۳۰ میں ہے جہاں "أَضْعٰفًا مُّضٰعَفَةً" کی قید کے ساتھ اس کی حرمت کا ذکر ہے۔ اس کے بعد سورۃ النساء کی آیت ۱۶۱ میں بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی لعنت کے اسباب میں ایک سبب یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ ربا کھاتے تھے۔ سورۃ البقرۃ میں آیات ۲۷۵ تا ۲۸۱ ربا کی حرمت کا ذکر ہے اور عام طور پر یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ آیات ۲۷۵ تا ۲۷۷ کا نزول پہلے ہوا جن میں کفار کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا کہ بیع حلال ہے تو ربا حرام کیوں ہے؟ پھر آخر میں آیات ۲۷۸ تا ۲۸۱ کا نزول ہوا جن میں ربا نہ چھوڑنے والوں کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے جنگ کا اعلان کیا گیا۔ اسی سلسلۂ بیان کی آخری آیت پر یہاں بحث ہو رہی ہے۔ اس بات کی ایک دلیل کہ یہ آیات آخری دور میں نازل ہوئیں۔ اس روایت میں ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ربا کی حرمت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت کچھ نہ پوچھا جا سکا، اس لیے ربا بھی چھوڑ دو اور جہاں ربا کا شک ہو

ہے وہ خاتمے کے لیے مناسب بھی معلوم ہوتی ہے لیکن اگر اس آیت کے موضوع کا کا سورۃ التوبۃ کی آخری آیات کے موضوع سے موازنہ کیا جائے تو راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ التوبۃ کی آیات کا نزول آخر میں ہوا۔ چناں چہ سورۃ البقرۃ کی آیت میں آخرت کی یاددہانی نہایت پر اثر الفاظ میں کی گئی ہے جو آیات الربا کے خاتمے کے طور پر نہایت مناسب ہے لیکن سورۃ التوبۃ میں رسول اللہ ﷺ کی پوری حیاتِ مبارکہ اور سیرتِ طیبہ سامنے رکھ کر یاد دلایا گیا ہے کہ ایسے رسول کی آمد تمھارے لیے کتنی بڑی نعمت خداوندی ہے لیکن اگر تم اس نعمتِ کبری کی قدر نہیں کروگے تو پھر اللہ تعالیٰ کو بھی، جو عرشِ عظیم کا مالک ہے، تمھاری کوئی پروا نہیں ہے: ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ﴾ (یقیناً تمھارے پاس تم میں سے ہی ایسا رسول آیا ہے جس پر تمھارا نقصان میں پڑنا شاق ہے، جو تمھاری کامیابی کے لیے حریص ہے، جو مومنوں کے لیے شفیق ہیں، مہربان ہیں۔ اے نبی! اگر یہ تم سے روگردانی کریں تو تم کہہ دو: میرے اللہ کافی ہے؛ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے؛ اسی پر میں نے بھروسا کیا؛ اور وہ عرشِ عظیم کا مالک ہے۔)

خاتمۂ قرآن کے لیے شاید یہی سب سے زیادہ مناسب الفاظ ہیں۔ کئی مکی سورتوں کے اختتام پر اس قسم کا اسلوب نظر آتا ہے اور اسی لیے بعض مفسرین نے ان آیات کو مکی قرار دیا ہے۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ الفاظ خاتمے کے لیے ہی مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں:

> اس سورت کے تمام مطالب اپنی اصل حیثیت میں اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتے جب تک یہ حقیقت پیشِ نظر نہ ہو کہ یہ تمام تر امت کے نام ایک وداعی پیام تھا اور احکام و مواعظ سے اصل مقصود مستقبل کے پیش آنے والے معاملات تھے، نہ کہ موجودہ۔ مفسرین کی نظر چونکہ اس پہلو پر نہیں گئی اس لیے انھیں اکثر مقامات کی شرح و توجیہ میں دقتیں پیش آئیں۔ یہ اصل پیشِ نظر رکھ کر سورت کے تمام مواعظ و احکام پر دوبارہ نظر ڈالو، صاف واضح ہو جائے گا کہ آئندہ مرحلوں کے لیے مخاطبین کو تیار کیا جا رہا ہے۔ (۵۹)

آخری دنوں میں ان آیات کے نزول کا ایک اور قرینہ یہ ہے کہ عہدِ صدیقی میں جمعِ قرآن کے وقت ان

(ریبۃ) وہ بھی چھوڑ دو۔ اس روایت پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے: ابو بکر احمد الرازی الجصاص، **أحكام القرآن**، تحقیق، محمد الصادق قمحاوی (بیروت: دار إحياء التراث العربي، ۱۹۹۲ء)، ۱: ۱۸۳- ۱۸۴۔

۵۹- آزاد، **ترجمان القرآن**، ۲: ۱۸۵۔

آیات کی مصحف میں کتابت کے متعلق مطلوبہ معیار پر گواہی میسر میں آنے میں کافی مشکل ہوئی اور بالآخر سیدنا خزیمہ رضی اللہ عنہ کی شہادت نے مطلوبہ معیار کے مطابق ثبوت فراہم کر دیا۔[۶۰] و الله تعالیٰ أعلم، و علمه أتم و أحكم.

نتائجِ بحث

سورة التوبة کی آیات کے زمانۂ نزول کی جو تحقیق ان تین مقالات میں پیش کی گئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سورة التوبة کی آیات کا نزول دس ٹکڑوں میں ہوا:

۱- فتح مکہ و حنین کے بعد جب اگلے سال مسلمانوں کو اہلِ روم نصاریٰ سے جنگ لڑنی پڑی تو اس سے کچھ قبل ۹ھ کے وسط میں سورة التوبة کی آیات ۲۹ تا ۳۵ کا نزول ہوا جن میں اہلِ کتاب سے اس وقت تک جنگ جاری رکھنے کا اعلان کیا گیا جب تک وہ اسلام قبول کرنے یا مسلمانوں کی حکومت کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ یہی حکم روم کے نصاریٰ کے خلاف جنگ کا اعلان قرار پایا اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کی تیاری شروع کی۔

۲- پھر جب اہلِ روم سے جنگ کا وقت آیا تو سفر تبوک پر روانگی سے کچھ قبل رجب ۹ھ کی ابتدا میں آیات ۳۸ تا ۴۲ کا نزول ہوا جن میں مسلمانوں کو جہاد کے لیے ترغیب دی گئی۔

۳- اس کے بعد جب مسلمان سفر تبوک پر روانہ ہوئے تو اس دوران میں آیات ۴۳ تا ۷۲ نازل ہوئیں جن میں منافقین اور مخلفین کے مختلف گروہوں کا تعاقب کر کے ان کے متعلق احکام دیے گئے۔

۴- پھر جب مسلمان سفر تبوک سے واپس ہوئے تو مدینہ منورہ پہنچنے سے کچھ قبل آیات ۷۳ تا ۹۶ نازل ہوئیں جن میں مخلفین سے نمٹنے کے لیے فیصلہ صادر کیا گیا۔

۵- اس کے بعد جب مسلمان مدینہ منورہ پہنچ گئے تو اہلِ مدینہ اور اہلِ بادیہ کے اہل ایمان اور منافقین کے مختلف گروہوں کے متعلق آیات ۹۷ تا ۱۱۶ میں حتمی احکام دے دیے گئے،

۶۰- الزرکشی، **البرهان في علوم القرآن**، ۱: ۲۳۳- ۲۳۴۔

البتہ تین مسلمانوں کا فیصلہ مؤخر کر دیا گیا۔

۶۔ اس کے بعد آیات ۱۱۷ تا ۱۲۲ کا نزول رمضان ۹ھ کے اواخر میں ہوا جن میں ان تین مسلمانوں کی توبہ کی قبولیت کا اعلان کیا گیا۔

۷۔ سفر تبوک کے دوران میں بعض مشرکین قبائل بھی موقع غنیمت جان کر عہد شکنی کر چکے تھے اور اب موقع آ گیا تھا کہ فتح مکہ کے بعد جن مشرکین کو عارضی امان (مخصوص مدت کے لیے یا مدت کی تعیین کے بغیر) دی گئی تھی، ان کے ساتھ آخری فیصلہ کیا جائے۔ چناں چہ تبوک سے واپسی کے بعد شوال ۹ھ میں سورت کی ابتدائی ۱۲ آیات کا نزول ہوا جن میں عہد شکنی کرنے والے مشرکین قبائل کے ساتھ معاہدات کے خاتمے کا اعلان کیا گیا۔ البتہ جن مشرکین نے عہد شکنی نہیں کی اور ان کے ساتھ معاہدہ غیر موقت تھا انھیں چار مہینوں کی مہلت دی گئی جبکہ ان مشرکین کے ساتھ معاہدہ برقرار رکھا گیا جن کے ساتھ معاہدات موقت تھے اور انھوں نے عہد شکنی بھی نہیں کی تھی۔

۸۔ جب معاہدات کے خاتمے کے متعلق آیات مشرکین تک پہنچا دی گئیں تو جاہلیت کے علم برداروں نے ابتدا میں سخت مزاحمت کا اعلان کیا۔ اسی وجہ سے آیات ۱۳ تا ۲۸ اور آیات ۳۶ تا ۳۷ کا نزول ہوا جن میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ مشرکین کے معاملے میں ذرہ برابر مداہنت نہ کریں اور ان کے ساتھ حتمی اور آخری جنگ کے لیے مکمل طور پر یکسو ہو جائیں۔ ان آیات کے نزول کے بعد مشرکین نے مزاحمت کا ارادہ ترک کر دیا۔[۶۱]

۹۔ مشرکین کی جانب سے مزاحمت کے خاتمے اور بظاہر قبولِ اسلام کے بعد مسلمانوں کو روم کے ساتھ جاری جنگ کے سلسلے میں پھر ہدایات دینے کے لیے صفر ۱۱ھ میں آیات ۱۲۳ تا ۱۲۷ کا نزول ہوا۔ ان آیات میں قریب کے کافروں سے جنگ کا حکم دیا گیا اور جہاد سے جی چرانے والوں کو تنبیہ کی گئی۔

۱۰۔ سب سے آخر میں سورۃ التوبۃ کی آخری دو آیات ۱۲۸-۱۲۹ کا نزول ہوا جن میں امت کو

۶۱۔ یہ مزاحمت انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد کی جب ارتداد کا سلسلہ چل پڑا اور پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں صحابۂ کرام نے ان احکام پر عمل کر کے جزیرۂ عرب کو شرک سے مکمل طور پر صاف کر دیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: مشتاق احمد، "سورۃ التوبۃ کے ابتدائی حصے کا زمانۂ نزول اور تاریخی پس منظر"، ۴۵-۴۷۔

رسول کی جانب سے الوداعی پیغام دیا گیا۔ انھی آیات پر قرآن کریم کے نزول کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

اس خاکے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ نزول کے اعتبار سے سورت بنیادی طور پر چار حصوں میں تقسیم ہے:

۱- اہلِ کتاب سے جنگ کے متعلق حصے (آیات ۲۹ تا ۱۲۲) کا نزول پہلے ہوا ہے اور یہ آیات ترتیبِ نزول کے مطابق ہیں۔[۶۲] اس سلسلے کا آغاز غزوۂ تبوک کے حکم سے ہوتا ہے اور پھر تبوک کی طرف جانے کی تیاری کے لیے اور سفر کے دوران میں اور واپسی کے بعد ان آیات کے مختلف ٹکڑوں کا نزول ہوا۔

۲- مشرکین سے جنگ کے متعلق حصہ (آیات ۱ تا ۲۸) کا نزول غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد دو ٹکڑوں میں ہوا؛ پہلے آیات ۱ تا ۱۲ اور پھر ۱۳ تا ۲۸۔ اسی دوسرے ٹکڑے کے ساتھ آیات ۳۶-۳۷ کا نزول بھی ہوا۔

۳- آخری حصے (آیات ۱۲۳- تا ۱۲۸) میں عود علی البدء کے اسلوب پر جہاد کے حکم کی مزید تاکید کی گئی اور قریب کے کفار کے ساتھ پوری شدت سے جنگ کا حکم دیا گیا۔[۶۳]

۴- سورت کی آخری دو آیات کی حیثیت خاتمۂ سورت ہی کی نہیں بلکہ خاتمۂ قرآن کی بھی ہے اور ان کا نزول رسول اللہ ﷺ کے وصال سے کچھ ہی قبل ہوا۔

هذا ما عندي، و العلم عند الله.

❁❁❁❁❁❁

۶۲- بیچ میں دو آیات ۳۶-۳۷ کی حیثیت جملۂ معترضہ کی ہے اور ان کا نزول آیات ۱۳ تا ۲۸ کے ساتھ ہوا۔

۶۳- یہاں یہ یاددہانی مناسب ہو گی کہ اس ہدایت پر عمل کی نوبت عہدِ رسالت میں نہیں آ سکی اور اس کا عملی نفاذ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوا۔ چناں چہ انھوں نے ان آیات پر عمل کرتے ہوئے اہلِ کتاب کے خلاف بھی جنگ جاری رکھی اور مرتدین اور مانعینِ زکاۃ کے خلاف جنگ بھی پوری یکسوئی سے کی۔